معارف

مارچ ۲۰۲۱ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۳۰؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰؍روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری؍منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۷ ماہ رجب المرجب ۱۴۴۲ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۲۱ء عدد ۳

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

ایک سال سے کچھ زیادہ کا عرصہ تو گزر گیا مگر اس عرصہ میں ملک بلکہ دنیا کے لیے ہر پل، ایک نئی اور پہلے سے بدتر حالت سے انسانی زندگی کو دوچار کرتا رہا، خدا جانے آنے والا مورخ اس کے بیان اور پھر تجزیہ و محاکمہ کے لیے الفاظ و تعبیرات کے بحرانوں سے کس طرح گزر سکے گا، خاص طور پر ملک عزیز نے گذشتہ پانچ چھ برسوں میں جو کچھ دیکھا، سنا، وہ ملک کی آزادی کے بعد بے شمار تکلیف دہ، اذیت ناک اور خوفناک حوادث کے باوجود فکر و دردرکھنے والوں کے لیے کسی عالم تحیر سے کم نہیں، نظریاتی طور پر حکومتوں کا تغیر و تبدل یقیناً معاشرہ پر اثر انداز ہوتا ہے، خصوصاً ان ملکوں یا معاشروں کو نظریات کے نشیب و فراز سے اکثر گزرنا ہوتا ہے جہاں ملوکیت اور آمریت یا ان دونوں کی سرپرست سرمایہ داری کے سائے زیادہ دراز ہوتے ہیں لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں آئین اور قانون کی اصل اور سرشت و خمیر ہی میں جمہور اور جمہوریت کی حکمرانی و پاسداری رچی بسی ہو وہاں اسی قانون کے سہارے سرمایہ داری پر مبنی آمریت کی جانب پیش قدمی اگر ملک کا سب سے اہم اور باعث فکر و تشویش مسئلہ سمجھا جائے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔

گذشتہ سال کے آغاز میں جب ملک کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد کو شہریت ترمیمی بل کی سنگینی اور اس کے پردے میں ملک کے اتحاد و سالمیت کو پارہ پارہ کردینے کی نیت کا احساس ہوا تو شاہین باغ پورے ملک کا ضمیر بن کر پرامن احتجاج اور جائز آئینی استحقاق کا ایک ایسا عالمی نشان یا سنگ میل بن گیا جس نے ایک جمہوری ملک میں وہاں کے باشندوں کے آئینی حق کے مطالبہ کی مثال قائم کردی کہ احتجاج پرامن، باوقار اور انصاف کے مطالبہ پر مبنی ہو تو حکمراں طبقہ کتنا ہی باجبروت ہو اس کے اندرون میں کمزوری سرایت کرنے لگتی ہے، دہلی کے فسادات کو اسی اندرونی کمزوری کی علامت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، جس کا اظہار پرامن اور نہتے انسانوں کے قتل اور ان کے اسباب زندگی کی غارت گری سے ہوا، آمروں، جابروں اور مکر و فریب کے ذریعہ حاصل کی گئی عارضی طاقت والوں کی محرومی یہی ہے کہ وہ خونی چہروں کے رقص شر کو اپنی فتح کا منظر سمجھنے لگتے ہیں لیکن کیا یہ سفا کی اور لہو کی سوداگری ہمیشہ انسانوں سے ان کی زندگی کی معنویت لوٹ کر ایک تعذیب مسلسل کی شکل میں جاری رہ سکتی ہے؟ اس کا جواب صرف ایک سال کے

بعد اسی شاہین باغ کی دہلی کے اطراف و جوانب میں کسانوں کے ذریعہ جس طرح دیا گیا وہ بھی اس ملک کی تاریخ کا کبھی نہ کبھی ایسا باب بنے گا جس کا اختتام ظلم و جبر کی شکست پر ہی ہوتا ہے۔

ملک کے کسانوں کا احتجاج تاریخی ہونے کے باوجود کامیاب یا ناکام رہتا ہے، اس کا جواب وقت کے ان مرحلوں کے پاس ہی ہے جو ابھی ظن و قیاس کی نگاہوں سے دور اور گردش دوراں میں مستور ہیں، ہم یہاں کسانوں کے مطالبہ یا حکومت کے ان قوانین کا ذکر اس لیے نہیں کرتے کہ اب یہ ہر شخص کے علم میں ہیں اور اس بنیادی سمجھ کے ساتھ ہیں کہ ایک جمہوری ملک میں جس کی آبادی کا بڑا بلکہ نصف سے بھی زیادہ حصہ کاشت کاروں پر مشتمل ہے، ان کے حق ملکیت پر شب خوں مارنے کی سازش ہے، یہ سب جانتے ہیں کہ پنجاب، ہریانہ، یوپی اور ان سے متصل علاقے کاشتکاری کے سب سے زیادہ زرخیز خطے ہیں، قدرتی طور پر یہاں کے کسان بھی زمین سے براہ راست تعلق کی وجہ سے ہمیشہ متحرک اور زندگی سے بھرپور پائے جاتے ہیں، علامہ شبلی نے ایک بار لاہور کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ مجھے تازگی اور جوش کی حرارت کی ضرورت جب محسوس ہوتی ہے تو میں پنجاب کا سفر کرتا ہوں تا کہ اپنی افسردگی کو جوش اور تازگی سے بدل سکوں، یہ خطہ ہمہ تن جنبش اور حرکت میں ہے، قدرتی طور پر حکومت کے نئے قوانین جن کو اصلاحات سے موسوم کیا گیا، کسانوں سے ان کے بنیادی حق سلب کرنے کے لیے وضع کیے گئے تو یہی خطہ سب سے پہلے سامنے آیا، علامہ شبلی نے تب کہا تھا کہ آپ اس جوش کا صحیح استعمال کیوں نہیں کرتے، اگر کرتے تو ضرور بڑھ جاتے، لگتا ہے سو سال بعد شبلی کی آواز سن لی گئی اور یہ بھی سمجھ لیا گیا کہ معاشی آزادی، سرمایہ داری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جن کو اس حقیقت کا علم ہے وہ کہتے اور لکھتے رہتے ہیں کہ فرد اور اس کی عام زندگی کو پرفریب ترغیب و ترہیب کے ذریعہ محض دولت کے چند سکوں کے عوض خریدنے میں سرمایہ داری ہمیشہ ایسے چرب زبان اور خود پسند لوگوں کو ہراول کے طور پر پیش کرتی ہے جو ہوتے تو ہیں محض آلہ کار لیکن بزعم خود پیش کار، بہت پہلے مولانا آزاد نے برطانیہ اور مغربی ملکوں کی سیاست کے بارے میں لکھا تھا کہ ان استعماری قوتوں کے مدبر ہمیشہ شیریں اور خوشگوار الفاظ بول کر اپنا کام نکالتے اور ہر حقیقت کو اس کے مخالف نام سے پیش کرتے ہیں، جب یہ کسی قوم کو غلام بناتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اسے آباد کرانے کے خواہاں ہیں، چنانچہ یہ انگریز اس سادہ لوح ملک سے یہی کہتے ہیں کہ ہم خیر خواہ ہیں، آزادی بخشنے والے ہیں، خوش حال

بنانا چاہتے ہیں، ہمارے یہاں ناروداری کی کوئی گنجائش نہیں، انگریز حکمراں ایک طرف یہ جملے فضاؤں میں بکھیرتے تھے، دوسری طرف جلیان والا باغ کو خون سے سینچا جارہا تھا، تاریخ کی گردش بھی کیا کیا دکھلاتی ہے، آج جمہوریہ ہند کے عوامی حکمراں ان ہی کے راگ الاپ رہے ہیں اور ان ہی کے نشانوں پر پنجے رکھ رہے ہیں جن سے بڑی قیمت دے کر آزادی حاصل کی گئی تھی، گاندھی جی کا خون کیا گیا، یہ بڑا المیہ تھا لیکن اس سے بڑا خون ان کے اس نظریہ کا ہوا کہ بنیادی ضرورت کی سب چیزیں دیہات میں پیدا ہوں اور وہاں کی مانگ پوری کرنے کے بعد شہر میں آ کر بکیں، انگریزوں کی پالیسی یہی تھی کہ دیہات سے اناج حاصل کر کے اپنے صنعتی کارخانوں میں تیار کی ہوئی یا باہر سے برآمد کی ہوئی صنعتی پیداوار کو دیہات میں فروخت کر کے سارا کا سارا پیسہ کھینچ لو، اور اس طرح ان کمزوروں کا استحصال ہوتا رہے، لوگوں نے آزادی سے پہلے بھی کاشتکاروں اور مزدوروں کو سادہ لوح ہندوستانی کہا تھا، آج اس سادہ لوحی سے وہ لوگ اور زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں جن کو اس سادہ لوحی کی حقیقت انگریزوں سے زیادہ معلوم ہے۔

جو کچھ ہو رہا ہے اس کی دنیا اتنی وسیع ہے کہ ہم جیسوں کے لیے معاشیات، اقتصادیات اور سیاسیات کے مضامین کے انبار بھی حقیقت کی تہ تک جانے میں کام نہیں آ سکتے، لیکن اگر آنکھوں پر پردے نہ پڑے ہوں تو یہ الفاظ تو دیکھ ہی سکتے ہیں کہ واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض، قالوا انما نحن مصلحون، پرفریب اصلاحات لانے والوں کی اس سے زیادہ صحیح شناخت اور کس ذریعہ سے ہو سکتی ہے، اس میں پیغام ہمارے ان راہنماؤں کے لیے بھی ہے جو اسلام اور مسلمان مسائل کی بات کرتے ہیں مگر کسانوں اور مزدوروں میں ان شکلوں اور ان کی مشکلوں کو نہیں دیکھ پاتے جن کے حقوق کی آواز بلند کرنے میں ان کے پاس الفاظ کی کمی نہیں۔

۲ر فروری کو رحمت حق سے جا ملنے والے ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کے ماتم کے بعد دعا یہی تھی کہ قلم کی سیاہی سے کوئی اور آنسو نہ ٹپکے، مگر آج ۲۷ تاریخ کے اخبار سے پروفیسر عبدالقادر جعفری کے انتقال کی خبر ملی، انا للہ، الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ عربی و فارسی کے سابق صدر سے زیادہ وہ اپنی شرافت، محبت اور دل کی پاکیزگی کے عکاس تبسم کی وجہ سے بھلائے نہ جا سکیں گے، دارالمصنّفین کیا ہر علمی ادارہ سے ان کا تعلق تھا، نہایت جاذب نظر، روشن و منور وجود کے حامل، باطن وظاہر کی ایسی خوبصورت ہم رنگی مشکل ہی سے دیکھنے میں آئے گی۔

مقالات

ریاست بہاول پور اور علی گڑھ کے تعلیمی تعلقات

ڈاکٹر عصمت درانی

جب سرسید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) نے علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا، اور جدید تعلیم اور یورپی علوم کو نجات کا ذریعہ قرار دیا تو ریاست بہاول پور (۱۷۲۷-۱۹۵۵ء) کے علم دوست اور روشن خیال فرمانرواؤں اور عوام نے اس تحریک پر نہ صرف لبیک کہا، بلکہ بھرپور اور ہر ممکن اعانت بھی کی۔ اسی تحریک کے زیر اثر حکمرانوں نے یہاں تعلیمی اصلاحات کا نفاذ کیا، انگریزی علوم کو شامل نصاب کیا اور اردو کو بھی ایک اہم مقام دلوایا۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل اساتذہ نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے علم و فضل سے یہاں کے طلبا کو مستفید کیا۔ ۱۸۷۹ء کے بعد کے ریاستی شعر و ادب کے مطالعہ سے بخوبی عیاں ہے کہ سرسید اور حالی کی تحریک اصلاحات کے اثرات نے یہاں کے شعر و ادب کو بھی متاثر کیا(۱)، ۱۸۸۶ء میں سرسید کے رفیق وحید الدین سلیم پانی پتی (۱۸۶۰ء-۱۹۲۸ء) کی یہاں آمد سے اسے مزید تقویت ملی۔ ان کے تربیت یافتہ شاگردوں اور اصلاحات کے دیگر حامی تخلیق کاروں نے علی گڑھ کی روایت کی آبیاری کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو وقف کر دیا۔ آہستہ آہستہ یہ اثرات گہرے ہوتے گئے اور شعرا و ادبا کی تخلیقات کی صورت اس تحریک کو اس خطے میں پھلنے پھولنے کے مواقع میسر آئے اور اسی کی بدولت عوام میں زندہ رہنے کی تڑپ پیدا ہوئی، جس کا لازمی نتیجہ آزادی کی خواہش ہوا کرتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس تعلیمی و ادبی شعور کے سبب اس خطے کے لوگوں اور ریاست کے حکمرانوں نے تحریک پاکستان میں مثبت اور تعمیری کردار ادا کیا۔

زیر نظر مضمون میں تحریک علی گڑھ اور ریاست بہاول پور کے علمی روابط، اور ریاست پر

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور۔

اس تحریک سے مرتب ہونے والے تعلیمی اثرات کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون کے پہلے حصے میں علی گڑھ تحریک کے لیے نوابان بہاول پور کی مالی و اخلاقی اعانت اور باہمی روابط، اور علی گڑھ سے وابستہ بعض مشاہیر کی یہاں آمد کا (بلحاظ ترتیب تاریخی) کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرے حصے میں ریاست پر اس تحریک کے تعلیمی اثرات اور یہاں علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ اور اساتذہ کرام کی علمی ضیا پاشیوں کا تذکرہ شامل ہے۔

(۱)

بہاول پور کے دستیاب تاریخی مآخذ کے مطابق ریاست بہاول پور اور سر سید احمد خان و علی گڑھ کے باہمی روابط کی ابتدا ۱۸۷۰ء سے ہوتی ہے، جب اس سال ۲۶ فروری کو سر سید احمد خان نے ایک وفد چندے کے حصول کی غرض سے بہاول پور بھیجا۔ اس موقع پر نواب صادق محمد خان رابع (عہد حکومت: ۱۸۶۶۔۱۸۹۹ء) کی والدہ (وفات: ۱۸۷۹ء) کی جانب سے دو ہزار روپے، اور ریاستی خزانے سے مزید ایک ہزار روپے بطور امداد علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (قیام: ۱۸۷۷ء) کے قیام کے لیے دیے گئے (محمد طاہر، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۴)۔ گویا علی گڑھ کے لیے سب سے پہلی مدد ریاست بہاول پور نے فراہم کی۔

نواب بہاول خان خامس کے عہد حکومت (۱۹۰۳۔۱۹۰۷ء) میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، اور ۸ اگست ۱۹۰۱ء کو علی گڑھ کالج ہسپتال فنڈ کے لیے دس ہزار کی رقم دی گئی (عزیز، ۱۹۳۹ء، ص: ۳۸)، ۱۲ نومبر ۱۹۰۳ء کو مذکورہ نواب نے اپنی مسند نشینی کے موقع پر اجداد کی تقلید میں علمی سرپرستی کے طور پر علی گڑھ کے لیے بھی دو ہزار روپے سالانہ کی امداد منظور کی۔ (عزیز، ۱۹۳۹ء، ص: ۱۰۳)

۱۹۰۷ء تا ۱۹۲۴ء، نواب بہاول خان خامس کی وفات اور صادق محمد خان خامس (عہد حکومت: ۱۹۲۴۔۱۹۶۶ء) کی کمسنی کے باعث ریاست میں کونسل آف ریجنسی کا دور رہا۔ اس دوران ان کی دادی کندن بی بی المعروف حضرت مائی صاحبہ اور کونسل آف ریجنسی کے صدر سر مولوی رحیم بخش (۱۸۵۷۔۱۹۳۵ء) نے نواب کے نمائندے کی حیثیت سے دیگر تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ علی گڑھ کی مالی معاونت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان امدادی رقوم کی تفصیل ریاست کے دفتر دستاویزات، محافظ خانہ میں ''اہم خطوط و دستاویزات ریاست بہاول پور (۱۸۷۲۔۱۹۲۱ء)''، نام سے محفوظ تھی۔ مثلاً: مارچ

۱۹۱۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی (قیام: ۱۹۲۰ء) کے قیام کے لیے ایک لاکھ پچاس ہزار (۱۵۰،۰۰۰) روپے کا عطیہ دیا گیا، ۱۹۱۶ء سے محمڈن کالج علی گڑھ کی علمی سرپرستی کے لیے دو ہزار (۲۰۰۰) روپے سالانہ امداد مقرر کی گئی۔ جب کہ آل انڈیا محمڈن اینگلو کانفرنس کے لیے بارہ سو (۱۲۰۰) روپے سالانہ امداد دی جاتی تھی (محمد طاہر، ۲۰۱۰ء، ص: ۲۰۵)، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے ایک لاکھ (۱۰۰۰۰۰) روپے دیے گئے (عباسی، قمر الزمان، ص: ۱۳۳)۔

۱۹۲۴ء میں اختیارات کی تفویض کے بعد نواب صادق خان خامس نے خود بھی اپنے پیش رو امرائے سلطنت کی طرح برصغیر کی اسلامی درس گاہوں، فلاحی انجمنوں، تعلیمی تحریکوں، تعلیمی اداروں اور اشاعت علوم کے مراکز کی بھرپور مدد کی، (۲) جن میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سرفہرست تھی، مثلاً: دسمبر ۱۹۲۵ء کو علی گڑھ کالج کی پچاسویں جوبلی کے لیے پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) روپے عطیہ دیا گیا (عزیز، ۱۹۳۷ء، ص: ۷۸)، ۱۹۳۰ء میں علی گڑھ کی ایک انجمن کے لیے ایک ہزار روپے (۱۰۰۰) روپے عطیہ دیے گئے (عباسی، قمرالزمان، ص: ۱۳۳)، دسمبر ۱۹۳۰ کو نواب صادق محمد خان خامس نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت کی اور ایک لاکھ (۱۰۰۰۰۰) روپے عطیہ دیا (عباسی، قمرالزمان، ص: ۱۱۹)، علی گڑھ میگزین کے اداریے میں علی گڑھ کی دیگر انجمنوں اور کلب کے لیے نواب صاحب کے فیاضانہ عطیات کا ذکر کیا گیا:

> "Following the true spirit of his great ancestors _ the Abbaside Caliphs of Baghdad_H.H. the Nawab of Bahawalpur extended his patronage to the institution by delivering the convocation address and his princely donation of Rs,100,000 to the University .He gave a further proof of his keen intrest in the welfare of the institution by giving several other donations to the various socities and clubs."(P:2)

۱۹۴۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کو ریاست کی وزارت تعلیم کی جانب سے میڈیکل کالج کے لیے دو لاکھ روپے کی رقم عطا کی گئی (بریلوی، مصطفیٰ علی، ص: ۲۰۴)، ریاست کی جانب سے علی گڑھ کے طلبہ کے لیے گندم بھی بھیجی جاتی تھی (محمد طاہر، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۴۰)، ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان اور ریاست کے پاکستان سے الحاق تک سالانہ چندہ کے طور پر بتیس سو (۳۲۰۰) روپے علی گڑھ کے لیے

ارسال کیے جاتے رہے، جب کہ دو ہزار کی سالانہ امداد الگ سے مقرر تھی۔ (محمد طاہر، ۲۰۱۰ء، ص: ۲۰۴)

درج بالا مالی معاونت کے علاوہ ریاست کے علم پرور اور ادب دوست حکمرانوں کے علی گڑھ سے علمی و ادبی روابط اور وفود کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی رہا۔ مثلاً:

۸ مارچ ۱۹۰۴ء کو نواب بہاول خان خامس چیفس کانفرنس میں شرکت کے لیے اجمیر شریف گئے تو محمڈن کالج علی گڑھ کا دورہ بھی کیا (عزیز، ۱۹۳۹ء، ص: ۱۱۱)، ریاست بہاول پور کے وزیر تعلیم میجر شمس الدین (دور وزارت: ۱۹۲۲-۱۹۴۹ء) کو مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی نشاۃ ثانیہ سے عشق کا جذبہ کشاں کشاں آل انڈیا مسلم لیگ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں لے جاتا تھا۔ انھوں نے ریاست میں تعلیمی اصلاحات کی غرض سے بذات خود جامعہ دہلی اور علی گڑھ یونیورسٹی کا تفصیلی جائزہ لیا تھا (بریلوی، مصطفیٰ علی، ص: ۲۰۴)، ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ کا وفد بہاول پور آیا۔ وفد کو باریاب سلام کیا گیا اور ریاست کی جانب سے عطیہ بھی دیا گیا (عباسی، جان محمد خان، ص: ۲۴۸)، ۳۰ ستمبر ۱۹۳۰ء کو نبیرۂ سر سید: سر راس مسعود (۱۸۸۹-۱۹۳۷ء) وائس چانسلر، اور ڈاکٹر ولایت احمد، پروفیسر شعبۂ قانون، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو ریاست کی جانب سے بالترتیب امتیازات ہارونیہ درجہ اول و درجہ ثانی سے نوازا گیا (عباسی، جان محمد خان، ص: ۲۵۳) (۳) دسمبر ۱۹۳۰ء کو نواب صادق محمد خان خامس نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت کی۔ اس موقع پر دیے جانے والا خطبہ صدارت، اور علی گڑھ یونیورسٹی میں وائس چانسلر سر راس مسعود، سابق پرو وائس چانسلر مسٹر ہنری مارٹن، کی معیت میں نواب صاحب کی یادگار تصاویر، بہاول پور کے علاوہ علی گڑھ کے تاریخی مآخذ میں محفوظ ہیں (۴) نواب صاحب نے صدارت کی اس دعوت کی وجہ ریاست اور علی گڑھ کے تاریخی روابط کو قرار دیا اور اس خطاب کو اپنی عزت افزائی جانا۔ اس خطبے سے اقتباس:

> “As a humble descendant of the great House of Abbasies,whos close association with letters and patronage of learning in thier own days,are too well known to require any mention here,it but behovesme to take a keen and lively interest in the welfare and future greatness of thisCentral Instructions of the Muslims of the India.And I assure you that my good wishes have always been with you in all your gallant efforts to raise it

to ats proper position of prestige and intellectual supremacy."
(Shan Mohammad,P:73)

۱۰ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو نواب صادق خان خامس کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طلبہ یونین (قیام: ۱۹۲۰ء) کا تاحیات رکن بنایا گیا۔ اس یونین کے رجسٹر پر نواب صاحب کے دستخط ''ہز ہائی نس صاحب بہادر نواب بہاول پور'' کی عبارت کے ساتھ آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ (۵)

۱۹۳۹ء میں جامعہ عباسیہ (موجودہ اسلامیہ یونیورسٹی) کو جدید تعلیم و افکار سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ریاست کی دعوت پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک اعلیٰ سطحی وفد بہاول پور آیا۔ انھوں نے جامعہ عباسیہ کے نصاب تعلیم، کتب خانے اور کمرہ ہائے جماعت، اور طرز تدریس کا معائنہ کیا اور جامعہ کے معیار پر خوشی کا اظہار کیا (شبلی نصیر الدین، ص:۸۳)

کونسل آف ریجنسی کے صدر سر مولوی رحیم بخش، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی تھے (سلیمان ندوی، ص:۴۰۲)، مولوی صاحب کے حبیب الرحمان خان شروانی (۱۸۶۷۔۱۹۵۰ء) سے علمی و ادبی اور مراسم تھے۔ مثلاً: علی گڑھ کے کتب خانہ: مولانا آزاد لائبریری (سابقہ کتب خانہ حبیب گنج) میں موجود کلیات ابن یمین کا ۱۰۲۷ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم نسخہ حبیب الرحمٰن خان شروانی کو نواب صادق محمد خان خامس کے ذاتی کتب خانہ سلطانی سے مولوی صاحب کی وساطت سے ہی میسر آیا۔ جس کے صفحہ ۱۰۲۳ پر ۲۲ر صفر المظفر ۱۳۴۱ھ کی تاریخ کے ساتھ مولانا کی سب سے پہلی یادداشت میں نسخے کی مکمل کیفیت اور یہ عبارت درج ہے:

> ''کلیات ابن یمین کا یہ منقول عنہ نسخہ نواب صاحب بہاول پور کے خاص کتاب خانہ میں تھا۔ مولوی رشید احمد صاحب انصاری نے اس کا پتا لگایا۔ مولوی سر رحیم بخش صاحب کونسل کے پریسڈنٹ کی مہربانی سے نقل کے واسطے مجھ کو ملا، جزا ھما اللہ عنی خیراً......''۔ (عطا خورشید، ص:۲۵۰۔۲۲۸)

۱۹۳۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وفد کے ممبران نے نواب صاحب کے ذاتی کتب خانۂ سلطانی کا دورہ بھی کیا اور نواب صاحب کی علم دوستی اور انتخاب سے بہت متاثر ہوئے۔ وفد سلام سے مشرف ہوا تو جملہ اراکین نے ان کی علم دوستی اور انتخاب کو سراہا، (عزیز، اپریل ۱۹۴۰ء، ص:۴۱) مولوی محمد عبید الرحمان شروانی (۱۸۹۷۔۱۹۹۲ء) بھی اس وفد میں شامل تھے۔ انھوں نے واپس جاکر اپنے والد

مولوی حبیب الرحمان خان شروانی سے کتب خانہ سلطانی میں موجود معجم کبیر طبرانی کا ذکر کیا۔ جس پر حبیب الرحمان خان شروانی نے کتاب دار کے نام خط میں لکھا:

"معجم کبیر طبرانی کی کیفیت پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ ایک نادر علمی سرمایہ ہے۔ کاش میں اس کی زیارت سے مشرف ہوتا۔" (عزیز، اپریل ۱۹۴۰ء، ص:۴۱)

۱۹۴۰ء میں ریاست بہاول پور کی معروف علمی وادبی شخصیت، ناظم کتب خانہ وعجائب خانہ سلطانی اور ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج عزیز الرحمٰن عزیز (۱۸۷۳-۱۹۴۴ء) نے العزیز نامی ایک علمی وادبی مجلہ کا اجرا کیا، جہاں ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون شروانی (۱۸۹۴-۱۹۲۲ء) کی نگارشات شائع ہوتی رہیں (۶)، ۱۹۴۳ء میں عزیز الرحمان عزیز کی مشہور تصنیف: صبح صادق، آغاز اسلام سے تمام خاندان عباسیہ اور ۱۹۴۲ء تک فرمانروایان ریاست بہاول پور کی مکمل تاریخ عزیز المطابع، بہاول پور سے شائع ہوئی، تو نبی بخش خان بلوچ (۱۹۱۷-۲۰۱۱ء) نے علی گڑھ سے مصنف کو خط لکھا اور یونیورسٹی کے کتب خانے کے لیے یہ کتاب منگوائی:

"آپ نے یہ کتاب لکھ کر ایک عظیم الشان احسان کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کتاب کا ایک نسخہ یہاں مسلم یونیورسٹی لائبریری میں رکھوا دوں، تاکہ یہاں کا علمی طبقہ آپ کی تصنیف سے روشناس ہو سکے۔ اس بارے میں کل اورینٹل سیکشن کے انچارج سے ملا، انہوں نے بھی پسند فرمایا ہے۔" (عزیز، دسمبر ۱۹۴۳ء، ص:۶)

۱۹۴۵ء میں، بیکر گارڈن آگرہ میں منعقدہ کانفرنس کے کل ہند اجتماع میں مولوی شمس الدین بہاول پور کے محکمہ تعلیم کے ایک بھاری بھرکم وفد کے ہمراہ شریک ہوئے، بہاول پوری وفد کی ترکی ٹوپیاں، شیروانی اور شلوار کا لباس عوام وخواص کی توجہ کو مبذول کرتا تھا۔ میجر صاحب نے "اسلام کا تعلیمی نظریہ" عنوان سے ایک مقالہ بھی پڑھا جو بے حد پسند کیا گیا (بریلوی، مصطفیٰ علی، ص:۲۰۴)، جنوری ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین (۱۸۷۳-۱۹۴۷ء) اور ڈاکٹر ہادی حسن (۱۸۹۶-۱۹۶۳ء) کو مختلف مواقع کی مناسبت سے صادق ایجرٹن کالج میں توسیعی لیکچرز کے لیے مدعو کیا گیا (طاہر، ۲۰۱۲ء، ص:۲۱)، مثلاً: ڈاکٹر ضیاء الدین جلسہ تقسیم انعامات کے لیے تشریف لائے (منور علی خان، ۱۹۸۶ء، ص:۵۹) لیکن اس تقریب کی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ ڈاکٹر ہادی حسن کی آمد بھی اسی سلسلے میں ہوئی۔ انھوں نے

اپنے فاضلانہ خطبے میں مترادفات اس کثرت سے استعمال کیے کہ سامعین محو حیرت تھے۔ڈاکٹر ہادی حسن کی خطابت سے سامعین وحاضرین پر جو طلسم طاری ہوا تھا،اسے علی گڑھ سے ہی فارغ التحصیل پرنسپل پیرزادہ عبدالرشید (۱۹۴۲۔۱۹۴۹ء) نے اپنی عالمانہ گفتگو کا جادو جگا کر توڑا۔گویا اس مجلس میں میزبان اور مہمان دونوں نے اپنی مادر علمی کا بول بالا کیا (منور علی خان،۲۰۱۲ء،ص:۹۸)۔۲۲ جنوری ۱۹۴۵ء کو ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور ڈاکٹر ہادی حسن نے صادق گڑھ محل،ڈیرہ نواب صاحب میں نواب صادق محمد خان خامس سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ ظہرانہ میں شرکت کی۔میجر شمس الدین بھی اس موقع پر شریک تھے۔انھوں نے کتب خانہ اور عجائب خانۂ سلطانی کا دورہ بھی کیا۔(بہاول پور گزٹ، ۲۵ جنوری ۱۹۴۵ء،ص:۲)

۲۶/اپریل ۱۹۴۶ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۸۹۷۔۱۹۶۹ء)،وائس چانسلر علی گڑھ کو صادق ایجرٹن کالج کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد میں خطبہ صدارت پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا،خطبے سے اقتباسات:

> ”میں اپنے محترم کرم فرما عالی مرتبت وزیر صاحب تعلیمات اور عزیز دوست پیرزادہ صاحب کا دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس موقع پر یاد فرمایا ہے اور اس جلسہ تقسیم اسناد میں اپنے فارغ التحصیل طلبا کو مخاطب کرنے کا شرف بخشا۔اس لیے اور بھی شکر گزار ہوں کہ اس دعوت نے پہلی بار ریاست بہاول پور میں حاضری کا موقع دیا۔جس کے بیدار مغز حکمران کے نام سے اس خاندان عباسی کی یاد تازہ ہے جس کی خدمت گزاری کو عدل وانصاف اور علم وحکمت کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ خدا انھیں اپنی مخلوق کی خدمت کی توفیق اور علم وحکمت کی دستگیری کی سعادت سے مالا مال فرمائے......اس خاندان خلافت اور اس فخر البلاد بغداد کے ساتھ نسبت سے یہاں کی حکومت اور خصوصاً یہاں کے علمی اور تعلیمی کام کرنے والوں کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔خدا انھیں اس کے اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔“
>
> (ذاکر حسین،ص:۲۶۱)

ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس موقع پر جامعہ عباسیہ کا دورہ بھی کیا۔(فرخ سلیم انصاری،ص:۲۲۵)

۱۹۶۳ء میں علامہ عبدالعزیز میمن (۱۸۸۸۔۱۹۷۸ء) جامعہ عباسیہ بہاول پور تشریف لائے

اور یہاں ایک ہفتہ قیام کیا۔ یہ آمد مولانا ناظم ندوی (۱۹۱۳-۲۰۰۰ء) کی دعوت پر ہوئی جو ۱۹۵۱ء تا ۱۹۶۳ء تک شیخ الجامعہ تھے۔ دوران قیام روزانہ بعد از نماز مغرب توسیعی خطبات ہوتے جن میں اساتذہ کے علاوہ عمائد شہر بھی شرکت کرتے۔ روزانہ کسی نہ کسی اہم موضوع پر گھنٹوں بے تکان گفتگو کرتے۔ ان خطبات کے علاوہ علمی محافل بھی منعقد ہوئیں اور انھوں نے یہاں کے علمی حلقوں کو بہت متاثر کیا۔ (راشد شیخ، ص: ۱۶۱-۱۶۳)

(۲)

علی گڑھ تحریک کے تحت مغربی تعلیم کے ثمرات سے ریاست بہاول پور پوری طرح بہرہ ور ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ سر سید احمد خان اور تحریک علی گڑھ کے دربار بہاول پور سے ۱۸۷۰ء سے قائم تعلقات تھے۔ یہاں جدید تعلیمی اداروں کے قیام کو اسی تحریک کے سلسلے کی ایک کڑی کہا جا سکتا ہے۔ ریاست کے تمام نوابان میں علم دوستی اور تعلیم کے ذریعے ریاست کو ترقی دینے کی لگن بہت زیادہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد حصول علم کے لیے لاہور کے بعد بہاول پور نمایاں مقام کا حامل رہا ہے۔ (۷)

علی گڑھ تحریک سے قبل یہاں دینی تعلیمی اداروں کا ایک وقیع سلسلہ نظر آتا ہے لیکن انگریزی طریق تعلیم کے سلسلے میں یکم مئی ۱۸۶۷ء کو ایجرٹن اسکول نام سے پہلا انگریزی اسکول اپر انگلش اورینٹل اسکول قائم ہوا اور ۱۸۷۰ء میں نواب صادق رابع کے اتالیق ڈارون کی سربراہی میں باقاعدہ تعلیم کے محکمے کی بنیاد رکھی گئی، (طاہر، ۲۰۱۲ء، ص: ۹) ۱۸۷۹ء میں ایجرٹن اسکول اور پھر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قیام (۱۸۷۵ء) کے چند سال بعد ۱۸۸۶ء میں صادق ایجرٹن کالج کے قیام کو بھی علی گڑھ سے تعلقات کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ادارہ سر سید کے مینارہ نور علی گڑھ سے مستنیر رہا۔ علی گڑھ کے علاوہ پورے برصغیر میں اس خصوصیت میں اس کا مثل نہ تھا کہ یہاں تعلیم بالکل مفت تھی۔ بلکہ طلبہ کو بکثرت سرکاری وظائف بھی دیے جاتے تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کا خرچہ پانچ روپے ماہوار سے زائد نہ تھا۔ (سید محمد عارف، ص: ۲۳۳)

صادق ایجرٹن کالج کی خوش قسمتی کہ اسے ابتدا میں ایسے راہ بر، سربراہ اور اساتذہ میسر آئے جو کسی نہ کسی صورت علی گڑھ سے وابستہ تھے، وہاں کے تدریسی تجربے کے حامل تھے، یا وہاں سے فارغ التحصیل تھے۔ مثلاً: کالج کے سابقون الاولون اساتذہ میں مولوی محمد دین (وفات: ۱۹۳۳ء)

ہیں جو ۱۸۸۲ء (قیاساً) میں نواب صادق محمد خان رابع کی دعوت پر صادق ایجرٹن کالج میں انگریزی اور فلسفہ کے استاد مقرر ہوئے، جو آل انڈیا محمڈن کانفرنس کے رکن اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کورٹ کے ممبر بھی تھے (منور علی خان، ۱۹۸۶ء، ص:۸۷)، وحید الدین سلیم پانی پتی ۱۸۸۶ء میں یہاں آئے اور چھ سال تدریسی خدمات انجام دیں۔ سلیم، سرسید کے رفیق کار اور ان کے حلقے کے آخری افراد میں سے تھے۔ ۱۸۹۸ میں سرسید کے انتقال کے بعد ان کی علمی و ادبی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں۔ کچھ عرصہ اخبار ''معارف'' نکالتے رہے۔ اس کے بعد ''علی گڑھ گزٹ'' کی ادارت کے فرائض سنبھال لیے۔

(حیات میرٹھی، ص:۸۷-۸۹)

علی گڑھ اسپرٹ کا عملی نمونہ بن کر اس کالج کو ترقی و کامرانی کی راہوں پر گامزن کرنے والے علیگ پرنسپلوں میں سب سے پہلا نام مشتاق احمد زاہدی کا ہے، جو علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں یہاں استاد مقرر ہوئے اور ۱۹۲۲ء تا ۱۹۳۵ء پرنسپل رہے۔ کبھی کبھی علی گڑھ کی اساتذہ کی تقلید میں چست پاجامہ اور شیروانی زیب تن کرتے (منور علی خان، ۱۹۱۲ء، ص ۹۶)، پیرزادہ عبدالرشید علی گڑھ کے شعبہ انگریزی کے استاد تھے، جب ڈاکٹر ضیاء الدین نے بوجوہ علی گڑھ چھوڑا تو پیرزادہ صاحب نے بھی چھوڑ دیا۔ ریاست میں آئے تو وزیر تعلیم میجر صاحب نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ صادق ایجرٹن کالج میں ۱۹۴۲ تا ۱۹۴۹ء پرنسپل رہے، (منور علی خان، ۱۹۸۶ء، ص ۵۸)، ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۲ء، آکسفورڈ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل پروفیسر ایرک چارلس ڈکنسن، جنھوں نے اپنی ملازمت کا آغاز علی گڑھ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے کیا تھا یہاں پرنسپل رہے۔ ۱۹۵۲ء میں اس کالج کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اقتصادیات کے ایک سابق پروفیسر عالمی شہرت یافتہ ماہر اقتصادیات محمد انوار الحسن کی خدمات میسر آئیں (طاہر، ۲۰۱۲ء، ص ۲۷)، ۱۹۷۱ء میں پروفیسر جی ایم دین مرزا، ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۲ء سید عصمت علی شاہ، ۱۹۷۲ تا ۱۹۷۹ء منور علی خان پرنسپل رہے، جو راول پنڈی کی علی گڑھ کے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے رکن اور سرسید ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ کی انتظامی خدمات انجام دیتے رہے (منور علی خان، ۲۰۱۲ء، ص:۱۰۰)، ۱۹۷۹ء میں اشرف علی شاہ پرنسپل بنے۔ جنھوں نے علی گڑھ سے ۱۹۴۴ء میں ایم اے جغرافیہ کیا تھا، ان کا پندرہ سالہ دور، علمی بصیرت، طلبا کی تربیت اور راہ نمائی سے عبارت تھا جو علی گڑھ کی دین تھا۔ وہ اپنے کردار اور عمل کے اعتبار سے علی گڑھ کا نمونہ تھے،

۱۹۸۵ء میں غفراللہ خان نے اس کالج کی سربراہی کا فریضہ انجام دیا۔ جو علی گڑھ کے فارغ التحصیل اور مسلم یونیورسٹی میں طبیعیات کے استاد تھے، اور ۱۹۵۲ء میں نقل مکانی کرکے بہاول پور آ گئے۔

دیگر علیگ اساتذہ کرام میں ڈاکٹر شجاع ناموس (ایم اے فارسی) نامور ماہر تعلیم، شاعر، ادیب، مصنف اور محقق، پروفیسر اقبال صدیقی، محمد انوار الحسن (ایم اے اقتصادیات)، ایس محمد ساجد (ایم اے ریاضی اور پی ایچ ڈی)، محمد نصیر انصاری (۱۹۴۴ء میں ایم اے فارسی اور ایل ایل بی)، رفیق اے خان (ایم اے انگریزی ادب)، جو بقول منور علی خان: ''علی گڑھ تحریک، علی گڑھ تہذیب، اور علیگیت کا ایک مرقع تھے۔'' تو قیر احمد۔ ایم اے طبیعیات، سید سرور حسن زیدی، ایم اے تاریخ اور ایل ایل بی تھے۔ پروفیسر سمیع اللہ، علی گڑھ ہی کے رہنے والے تھے اور وہاں سے ایم اے انگریزی کرنے کے بعد ریاست میں آئے تھے (منور، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۰۶)۔ یہ قابل و فاضل سربراہان اور اساتذہ، کالج کی تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے علم و فضل کی ضیا پاشیوں سے طلبا کو مستفید کرنے کے علاوہ یہاں کے ماحول کو نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے اعتبار سے علی گڑھ کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے رہے، جس کے نتیجے میں علی گڑھ کی روایات یہاں جاگزین ہونے لگیں اور اس ادارے کو ''چھوٹے علی گڑھ'' سے تعبیر کیا گیا۔

ریاست کے عوام میں تعلیمی شعور بیدار ہوا اور علی گڑھ کی اہمیت و وقعت سے آگاہی ہوئی تو بہاول پور کے طلبہ بھی حصول تعلیم کی غرض سے علی گڑھ گئے۔ ان طلبہ نے تحصیل سے فراغت کے بعد ریاست میں گرانقدر علمی و ادبی خدمات انجام دیں۔ یہ ایک طویل فہرست ہے جس کا احاطہ ممکن نہیں، مثلاً: بہاول پور کے محلہ قاضیاں سے منظور احمد علوی (وفات: ۱۹۶۰ء) علی گڑھ سے ایم۔ اے عربی (گولڈ میڈلسٹ) کی تحصیلات کے بعد انسپکٹر اسکولز اور سیکرٹری (چیف آفیسر) میونسپل کارپوریشن کے عہدوں پر فائز رہے۔ عزیز الرحمان کی وفات کے بعد ان کا تقرر بحیثیت کتاب دار کتب خانۂ سلطانی ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں عراق کے شاہ فیصل نے ریاست بہاول پور کا دورہ کیا تو اس دوران مترجم کے فرائض بھی منظور احمد علوی نے انجام دیے، محلہ درکھاناں کے حافظ جان محمد خان (۱۹۱۰۔۱۹۸۵ء) علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد محکمہ تصریفات میں توشہ خانہ کے مشیر مقرر ہوئے۔ نواب صادق محمد خان خامس کے صاحبزادوں کی اتالیقی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، بعدازاں عجائب خانۂ سلطانی

میں ناظم، اور پھر کتاب دار کے عہدے پر ترقی حاصل کر لی۔ نعت گو شاعر تھے۔ فارسی، اردو اور سرائیکی میں شعر کہتے تھے۔ ان کا کلام صادق الاخبار، اور ماہنامہ الہام میں شائع ہوتا رہا (عصمت درانی، ص: ۱۴۶۔۱۴۷)، چاچڑاں شریف کے معین الدین حسن نے علی گڑھ سے ایم اے انگریزی کیا۔ بہاول پور کے پہلے ایم اے انگریزی تھے۔ وہ علی گڑھ کے تعلیمی و تربیتی ماحول سے بہت متاثر ہوئے، مسلم لیگ کی کارروائیوں میں بھی حصہ لیتے رہے اور یونیورسٹی مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری بھی منتخب ہوئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس، منعقدہ پٹنہ میں جہاں محمد علی جناح کو قائد اعظم کے خطاب سے نوازا گیا، معین الدین حسن نے علی گڑھ کے طلبہ کے وفد کی نمائندگی کی۔ قائد اعظم اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، یونیورسٹی ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن بھی رہے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۷۲ء تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ سبکدوشی کے بعد بہاول پور کی بیسیوں علمی اور سماجی انجمنوں کے سکریٹری اور رکن رہے، پروفیسر نصیر انصاری کا تعلق بہاول پور سے تھا۔ علی گڑھ سے ایم اے فارسی اور ایل ایل بی کیا، سید رحمت شاہ احمد پور شرقیہ سے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ سے ایم اے عربی اور ایل ایل بی کیا۔ علی گڑھ میں فٹ بال الیون میں شامل تھے اور کلر بھی ملا (منور علی، خان، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۰۲۔۱۰۵)، بستی سجاول والا کے عبدالقادر جوہر (۱۹۱۳۔۱۹۹۲ء) بہاول پور کے عباسی خاندان کے پہلے شخص تھے جنھوں نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ بہاول پور کے معروف شاعر اور فارسی کے عالم استاد تھے، بہاول پور کے محلہ قاضیان کے رہائشی فضل اللہ فاروقی بن مولوی فیض محمد (۱۹۱۸۔۱۹۸۳ء) نے ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ سے ایم اے عربی (گولڈ میڈلسٹ) کے علاوہ ایل ایل بی (گولڈ میڈلسٹ) کی اسناد حاصل کیں۔ عبدالعزیز میمن کے شاگرد تھے، جن کی مارچ ۱۹۵۰ء کی محررہ تعریفی سند آج بھی ان کے خاندان میں موجود ہے۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۴ء بہاول پور میں سول جج اور مجسٹریٹ رہے۔ اپنی ذاتی لائبریری ''الفیض'' نام سے قائم کی۔ جس میں عربی فارسی انگریزی، فرانسیسی، سرائیکی اور ہندی زبان میں کتابیں اور برصغیر کے جرائد کی فائلیں تھیں۔ ان کے نام ڈاکٹر ذاکر حسین کا ایک غیر مطبوعہ خط: ۸ ملاحظہ کیجیے:

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۳۳ء

عزیز مکرم! السلام علیکم

آپ کا محبت نامہ کئی روز ہوئے ملا تھا، اسی زمانہ میں مجھے چند روز باہر جانا پڑا۔ اس لیے بروقت جواب نہ دے سکا، معاف فرمائیں۔ آپ نے اپنے متعلق مجھ سے مشورہ چاہا ہے اور از راہ عنایت اپنے متعلق تفصیلات سے مجھے آگاہ فرمایا ہے۔ میری رائے ہے کہ جس شخص کو یہ لگن ہو کہ وہ اپنی زندگی کو سدھارے اور صحیح راستہ پر لگائے۔ اس کے لیے خود اس کی یہ لگن دلیل راہ بن جاتی ہے اور تفصیلات میں بھی جہاں کوئی خاص مشورہ نہیں ہوسکتا۔ اس کا یہ جذبہ اس کی رہنمائی کرتا اور اس کے لیے صحیح راہیں نکال لیتا ہے۔ الحمدللہ کہ آپ میں یہ جذبہ موجود ہے۔

میں تو آپ کو یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ اگر آپ اپنی زندگی کو کسی بڑے مقصد کے لیے وقف کرنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اپنی زندگی کو ایسا سنواریں کہ اس کی نذر پیش کرتے ہوئے آپ کو شرم نہ آئے۔ اپنی تمام خداداد صلاحیتوں کو بدرجہ اتم ترقی دینا اور انھیں اپنے مقصد عظیم کی امانت جاننا انسان کے ہر چھوٹے بڑے فعل کو عبادت بنا دیتا ہے اور یہی غایت وجود انسانی ہے۔

تعلیم کی جگہ......کوشش میں مدد ہوسکتا ہے یا مانع۔ لیکن اس کی اہمیت اتنی نہیں جتنی اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔ طالب علم کی کیفیت ذہنی پر اس کا انحصار ہے، میری رائے ہے کہ آپ پوری محنت سے اپنی تعلیم جاری رکھیں۔ تندرست رہنے کی کوشش کریں اور اپنے قوائے ذہنی اور جسمانی کو امانت سمجھیں اور اس میں خیانت سے بچیں۔

جامعہ میں ایم اے کی جماعت کھولنے کی ضرورت اس لیے نہیں ہوئی کہ جو لوگ کسی شعبہ علم کا تفصیلی مطالعہ چاہتے ہیں، وہ امتیازی سند کے لیے تین سال تعلیم پاتے ہیں۔ اور یہی ایم اے کی تعلیم میں پیش نظر ہوتا ہے۔

مکتبہ کی جانب گروہ میں......فہرست کتب بھیجتے رہیں، امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

خیر طلب

ذاکر حسین

مذکورہ بالا کے علاوہ، علی گڑھ سے فارغ التحصیل دیگر بہت سے طلبہ نے علم اور قومی اتحاد و ترقی کا سبق ریاست کے گوشے گوشے میں پھیلایا، بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ سرسید احمد خان نے مذہب، ملک و قوم

کی راہ نمائی کا فریضہ انجام دینے کا جو عزم صمیم کیا تھا، اس کے اثرات وثمرات ہزاروں میل دور ایک چھوٹی سی ریاست تک بھی پہنچے۔ جس کے زیر اثر سماجی، سیاسی اور تعلیمی شعور کی بیداری ہوئی اور اسی سبب اس خطے کے لوگوں اور ریاست کے حکمرانوں نے تحریک پاکستان اور قیام پاکستان میں کلیدی کردار ادا کیا۔

حواشی

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: ماجد قریشی (۱۹۶۴ء)، دبستان بہاول پور، ادارہ مطبوعات آفتاب مشرق، بہاول پور۔ (۲) امداد پانے والے اداروں میں انجمن حمایت اسلام، دارالعلوم ندوہ و دیوبند اور جامعہ ملیہ شامل تھے۔ (۳) نواب صادق محمد خان خامس کے دور میں یہ اعزازات علمی خدمات کے اعتراف میں دیے جاتے۔ امتیاز ہارونیہ کے تین درجے تھے، اولی، ثانی اور ثالث۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: عزیز، عزیزالرحمٰن (۲۰۰۸ء) جج صادق، (طبع نو) بہ سعی حفیظ خان، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، ص: ۸۱۔ ۸۲۔ (۴) دیکھیے: علی گڑھ میگزین (سہ ماہی)، علی گڑھ نمبر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جنوری، جلد ۱۶، نمبر ۴، ۱۹۳۹ء۔ (۵) اطلاع وعکس، بشکریہ ڈاکٹر عطا خورشید، انچارج شعبہ شرقیات، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، بتاریخ ۱۶ جنوری ۲۰۱۹ء، بذریعہ واٹس ایپ۔ (۶) دیکھیے العزیز، ماہنامہ، عزیز المطابع، بہاول پور، مئی ۱۹۴۰ء، ص ۱۸۔ (۷) ۱۸۸۶ء میں جب یہ کالج معرض وجود میں آیا تو پنجاب میں صرف تین کالج تھے، گورنمنٹ کالج لاہور، ایف سی کالج لاہور اور سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی، پنجاب کی ریاستوں میں مہندر کالج پٹیالہ، ایس ای کالج کے ایک سال کے بعد قائم ہوا۔ کپورتھلہ ریاست میں رندھیر کالج دس سال بعد کھلا۔ ریاست جموں کشمیر میں ایس پی کالج سری نگر اور پرنس آف ویلز کالج کے قیام میں بیس سال لگے۔ ملتان کا ایمرسن کالج ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا (دیکھیے: منور علی خان، ایس ای کالج کے سو سال: ۱۸۸۶۔ ۱۹۸۶ء، ص ۲۲)۔ (۸) فضل اللہ فاروقی، مشاہیر سے مراسلت رکھتے تھے۔ ان کے نام سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، غلام رسول مہر، ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریہ ہند) کے خطوط قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر عبدالعزیز میمن کی تعریفی سند، اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا ان کے نام یہ خط فضل اللہ فاروقی کے بھانجے نعمان فاروقی، استاد شعبۂ اردو، صادق پبلک اسکول بہاول پور کے پاس محفوظ ہے۔

کتابیات

(۱) حیات میرٹھی (۱۹۶۱ء) نقوش رفتگان، ادارہ آفتاب مشرق بہاول پور، استقلال پریس لاہور۔ (۲) راشد شیخ، محمد،

(۲۰۱۱ء)علامہ عبدالعزیز میمن،سوانح وعلمی خدمات،قرطاس،کراچی۔(۳)شبلی،نصیرالدین(۲۰۱۶ء)،شخصیت و افکار۔شیخ الاسلام محدث گھوٹوی،حضرت شیخ الاسلام اکیڈمی،ملتان۔(۴)عباسی،جان محمد خان،تذکرہ نوابان بہاول پور و خلفائے راشدین،عکس مخطوطہ،نسخہ کتب خانہ الحسن الحسینن،رحیم یارخان۔(۵)عباسی قمرالزمان(۲۰۱۱ء)،بغداد سے بہاول پور تک،(طبع چہارم)،بیت الکتب،بہاول پور۔(۶)عزیز،عزیز الرحمٰن(۱۹۳۷ء)حج صادق (طبع اول)، پالم پور۔(۷)ایضاً،(۱۹۳۹ء)حیات محمد بہاول خان خامس عباسی،عزیز المطابع،بہاول پور۔(۸)عصمت درانی (۲۰۱۸ء)،کتب خانہ سلطانی(قیام سے تقسیم تک)،دارالسلام،لاہور۔(۹)محمد طاہر(۲۰۱۰ء)ریاست بہاول پور کا نظم مملکت(۱۸۶۶ تا ۱۹۴۷ء)،بزم ثقافت،ملتان۔(۱۰)منورعلی خان (۱۹۸۶ء)،ایس ای کالج کے سو سال (۱۸۸۶-۱۹۸۶ء)صادق ایجرٹن کالج،بہاول پور۔

11- Ali Garh Magazine ,Editorial,Ali Garh Muslim University,Ali Garh,India.

12- Shan Mohammad, Prof, Glimps of Muslim Education In India,(Peeping Through The Convocation Adresses of The Aligarh Muslim University), Vol:1, Anmol Publications Ptv.Ltd,New Delhi,India.

اخبار و جرائد

(۱)بہاول پور گزٹ،۲۵ جنوری ۱۹۴۵ء۔(۲)بریلوی،مصطفی علی(۱۹۹۴ء)،بہاول پور کی تعلیمی سرگزشت،مشمولہ: الزبیر،بہاول پور نمبر،اردو اکیڈمی،بہاول پور۔(۳)ذاکر حسین(۱۹۹۴ء)،خطبات بہاول پور،مشمولہ: الزبیر، بہاول پور نمبر،ایضاً۔(۴)سلیمان ندوی(جون ۱۹۳۵ء)،شذرات،مشمولہ معارف،(ماہنامہ)مجلس دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،ہندوستان۔(۵)سید محمد عارف(۱۹۹۴ء)،"صحرائے چولستان کا عظیم مینارہ نور۔صادق ایجرٹن کالج بہاول پور"،مشمولہ: الزبیر،بہاول پور نمبر۔(۶)عزیز،عزیز الرحمٰن(اپریل ۱۹۴۰ء)،بزم عزیز،العزیز، عزیز المطابع،بہاول پور۔(۷)ایضاً"نوادر کتب خانہ سلطانی"،مشمولہ: العزیز،ایضاً۔(۸)ایضاً،(دسمبر ۱۹۴۳ء)، بزم عزیز،مشمولہ: العزیز،ایضاً۔(۹)عطا خورشید(۲۰۱۴ء،شمارہ: نومبر-دسمبر)"علامہ شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی-کتاب خانہ حبیب گنج کی روشنی میں"،مشمولہ: معارف،ہندوستان۔(۱۰)فرخ سلیم انصاری(۱۹۹۴ء) "اسلامیہ یونیورسٹی،بہاول پور"الزبیر،سہ ماہی،(بہاول پور نمبر)۔(۱۱)محمد طاہر(۲۰۱۲ء)،"صادق ایجرٹن کالج کی ایک سو ستائیس سالہ تاریخ کا جائزہ"،مشمولہ: نخلستان ادب،شخصیات نمبر،گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج،بہاول پور۔ (۱۲)منورعلی خان(۲۰۱۲ء)،"ایس ای کالج بہاول پور"،مشمولہ نخلستان ادب،ایضاً۔

رشید حسن خاں اور ڈاکٹر گیان چند جین

جناب ٹی۔آر۔رینا

اردو زبان وادب کی یہ خوش نصیبی رہی ہے کہ اس کے آغاز سے ہی اس کی آبیاری اس ملک کی مشترکہ تہذیب کی دو قوموں (ہندو مسلمان) کے علمانے کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یونیسکو(Unesco) جیسے عالمی ادارے کے ایک سروے کے مطابق یہ دنیا کی تیسری بڑی زبان کے طور پر جانی جاتی ہے۔ دنیا کے بیالیس ممالک کی یونیورسٹیوں میں اس زبان کے شعبے قائم ہیں۔دنیا کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے ملکوں میں اس زبان کا بولنے والا مل جائے گا۔

عنوان میں جن دو شخصیات کے نام آئے ہیں انھوں نے زبان وادب سے متعلق وہ کام کیے ہیں جن سے رہتی دنیا تک آنے والی ادبی نسلیں مستفید ہوتی رہیں گی۔ان حضرات نے کسی ایک دائرے میں رہ کر کام نہیں کیا ہے بلکہ متعدد موضوعات پر لکھتے ہوئے انھوں نے اپنی عمریں ادب کی نذر کردیں۔

میں پہلے جین صاحب سے متعلق گفتگو کرنا چاہوں گا، کیونکہ ہماری تہذیب ہمیں اپنے سے بڑوں کا احترام کرنا سکھاتی ہے، چاہے یہ فرق ایک ہی دن کا کیوں نہ ہو۔جین صاحب خاں صاحب سے قریب دو سال بڑے تھے۔خاں صاحب انھیں اپنے سے عمر میں ہی بڑا نہیں بلکہ علمی لحاظ سے بھی بڑا مانتے تھے۔اس کا اقرار وہ یوں کرتے ہیں:

> ”وہ عمر میں مجھ سے دو سال بڑے ہیں، اس نسبت سے اپنے آپ کو بوڑھا کہتے ہیں اور مجھے جوان۔مگر بوڑھے لوگ اس قدر کام نہیں کیا کرتے اور اتنی محنت نہیں کر پاتے۔ان کا اپنے آپ کو بوڑھا کہنا، میرے لیے کبھی قابل تسلیم نہیں ہوسکتا۔میں ان کو ہر لحاظ سے اپنے سے بڑا مانتا ہوں اور دعا کرتا رہتا ہوں کہ وہ اسی

☆ایف ۲۳۷،لوئر یری سنگھ نگر، رہاڑی کالونی، جموں۔۱۸۰۰۰۵،موبائل: ۹۴۱۹۸۲۸۵۴۲۔

طرح کام کرتے رہیں کہ اب ہمارے یہاں ایسے ڈوب کر، دل لگا کر اور سمجھ بوجھ کر کام کرنے والے بہت کم رہ گئے ہیں''۔ (''جین صاحب'' از رشید حسن خاں، ماہنامہ ''آج کل''، نئی دہلی، اپریل ۱۹۹۹ء، ص ۸ تا ۱۱، مشمولہ ''مقالات رشید حسن خاں'' مرتب راقم الحروف، غیر مطبوعہ، جلد چہارم، ص ۴۱۷)

جین صاحب نظم ونثر، تحقیق، تنقید، لسانیات، عروض، قواعد زبان، تاریخ، سوانح، شرح کلام، ترتیب کلام کے مردِ میدان کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ ان کی کتب کی نامکمل فہرست کچھ اس طرح سے ہے:

اردو کی نثری داستانیں (اشاعت اول ۱۹۵۴ء، کراچی)، اردو مثنوی شمالی ہند میں (۱۹۶۹ء)، اردو کی ادبی تاریخیں (۲۰۰۰ء)، اردو ادب کی تاریخ ۱۷۰۰ء تک، بہ اشتراک سید جعفر، اردو کا اپنا عروض (۱۹۹۰ء)، ابتدائی کلام اقبال، بہ ترتیب ماہ وسال (۱۹۹۳ء)، تفسیر غالب (غالب کے منسوخ کلام کی شرح)، عام لسانیات، ادبی اصناف، شخصیات ومشاہدات، اپندر ناتھ اشک، قاضی عبدالودود (بحیثیت مرتب متن)، تحقیق کا فن، ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب (۲۰۰۵ء)، تجزیے، رموز غالب، حقائق، لسانی رشتے (۲۰۰۳ء)، لسانی مطالعے (۲۰۱۰ء)، تحریریں، ذکر وفکر، کھوج، پرکھ اور پہچان، مقدمے اور تبصرے، شعری مجموعہ ''کچے بول'' (۱۹۹۱ء)۔

ان کے علاوہ ان کے کچھ غیر مطبوعہ مضامین مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں جو کسی مرتب کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ اردو کے لیے لکھا جس کے لیے ملک یا سرحدوں کی کوئی قید نہیں۔

جین صاحب کی پیدائش ۱۹ ستمبر ۱۹۲۳ء قصبہ سیوہارہ، ضلع بجنور، صوبہ اترپردیش کی ہے۔ ابتدائی تعلیم یہیں کی ہے۔ ۱۹۴۱ء میں بی، اے میں الہ آباد یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں ایم، اے اور ۱۹۴۸ء میں ڈی، فل کی ڈگری یہاں سے ہی حاصل کی۔ اس وقت اسی ڈگری کو پی ایچ ڈی کے برابر تسلیم کیا جاتا تھا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا ''اردو کی نثری داستانیں''۔ پہلی اور دوسری بار یہ مقالہ ۱۹۵۴ء اور ۱۹۶۵ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ دوسری بار اس میں کافی حد تک ترمیم واضافہ کیا گیا، تیسری بار ۱۹۸۷ء میں یوپی اردو اکادمی لکھنؤ سے اور چوتھی بار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے مزید حذف واضافے کے ساتھ منظر عام پر آیا۔

رشید حسن خاں صاحب کے پاس اس کا پہلا اور تیسرا ایڈیشن موجود تھا۔انہوں نے دونوں کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''اس کے پہلے اور تیسرے ایڈیشن کو سامنے رکھا جائے تو اندھیرے اجالے کا فرق نظر آئے گا''۔ تیسرے ایڈیشن کے پیش لفظ ''پہلی بات'' میں انہوں (جین صاحب) نے لکھا ہے:

''ایک فلسفی نے اپنے جوتے کا پورا تلا بدلوالیا۔ کچھ مہینے گزرنے کے بعد اس نے تلے کا حصہ برقرار رکھ کر اوپر کا حصہ بدلوالیا۔ اب وہ اس فکر میں کھو گیا کہ یہ اس کا وہی پرانا جوتا ہے کہ دوسرا نیا جوتا۔ ادھر وہ اس مراقبے میں غرق ہے، ادھر میں سوچ رہا ہوں کہ موجودہ ہیئت میں یہ کتاب ''نثری داستانیں'' کیا وہی مقالہ ہے جس پر مجھے ڈگری ملی تھی۔ ۳۶ سال گزر جانے کے بعد اس نے وہ نقشہ، مہرہ بدلا ہے کہ جس نے اسے بچپن میں دیکھا تھا، وہ پہچان نہیں سکتا۔ میں اپنی نو عدد مطبوعہ اور ایک عدد زیر طبع یعنی دس کمزور تصانیف میں اسے بہترین سمجھتا ہوں''۔ (ایضاً، ص ۴۱۲۔۴۱۳)

یہ تو آپ نے جین صاحب کی رائے سنی۔ اب جین صاحب سے متعلق خاں صاحب کی رائے سنیے:

''ہمارے یہاں یہ بات کم (بلکہ بہت کم) دیکھنے میں آتی ہے کہ اپنے پچھلے کام کو خود ہی ناتمام سمجھ کر اس پر نظر ثانی کی جاتی رہے۔ اس طرف توجہ عموماً یوں نہیں کی جاتی کہ اس کے لیے مسلسل پڑھنا پڑتا ہے اور یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کہاں کوئی نئی بات یا کوئی کام کی بات لکھی گئی ہے۔ اب ہم میں سے بیشتر افراد اسی کھکھیڑ اٹھانے کے قائل نہیں۔ یہ جین صاحب کی خوبی ہے کہ وہ گہرے تعلق خاطر کے ساتھ مصروف مطالعہ رہتے ہیں اور ''زہر خرمنے خوشۂ یافتم'' کے مشہور قول کی صداقت کو روشن کرتے رہتے ہیں۔ اضافے بھی کرتے رہتے ہیں اور تصحیح و ترمیم بھی''۔ (ایضاً، ص ۴۱۳)

ہم وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ان دونوں شخصیات کا ادبی رشتہ کب قائم ہوا لیکن خاں صاحب کی دو ایسی تحریریں ہمارے پاس موجود ہیں جن کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب جین صاحب کی پہلی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں'' شائع ہوئی تو تب سے ہی شاید یہ ایک دوسرے کو

جاننے لگے تھے۔جیسا کہ تھوڑی دیر قبل اس کا ذکر آچکا ہے:

> ”پہلا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں پہلی بار کراچی سے شائع ہوا) میری نظر سے گزرا ہے۔ اسے اور تیسرے ایڈیشن (یہ ۱۹۸۷ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا) کو سامنے رکھا جائے تو اندھیرے اجالے کا فرق نظر آئے گا“۔(ایضاً)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خاں صاحب ”اردو کی نثری داستانیں“ کا مطالعہ ۱۹۵۴ء میں ہی کر چکے تھے۔یوں تو جین صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۷ء میں شاعری سے ہوتا ہے مگر تحقیقی دنیا میں انہوں نے ۱۹۴۵ء میں قدم رکھا، جب انہوں نے ڈی.فل کی ڈگری کے لیے الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ٹھیک ۱۹ سال بعد ۱۹۵۴ء میں یہ اپنے پہلے تحقیقی کارنامے ”اردو کی نثری داستانیں“ کے ساتھ ادبی دنیا سے متعارف ہوئے۔

دوسری تحریر خاں صاحب کا وہ خط ہے جو انہوں نے ایف ۳/۴ ماڈل ٹاؤن، دہلی۔۹ بتاریخ ۶ر ستمبر ۱۹۷۴ء کو جین صاحب کے نام لکھا:

> ”مکرمی!
>
> محبت نامہ ملا تھا۔یہ ”دیوُتش“ کی خوب رہی۔بہر حال، آپ کی داد سر آنکھوں پر اور اس بار کی قید کیا ہے، یہ واقعہ ہے کہ آپ نے ہر مناسب موقعے پر اپنی پر خلوص ہمت افزائی سے کام کرنے کا حوصلہ بڑھایا ہے، اس کا مجھے اعتراف ہے“۔(”رشید حسن خاں کے خطوط“ جلد اول، مرتب راقم الحروف، اشاعت فروری ۲۰۱۱ء، اردو بک ریویو، نیو دہلی۔۲، ص ۲۶۴)

خط کا متن یک طرفہ ہے، پتا درج نہیں، لیکن جین صاحب ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۶ء صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی رہے۔خط کے متن سے عیاں ہوتا ہے کہ دونوں شخصیات کے ادبی مراسم دیرینہ اور ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ادبی رشتے دوسرے تمام رشتوں سے افضل و بے لاگ ہوتے ہیں۔۱۹۷۴ء تک دونوں حضرات الگ الگ ادبی دنیا میں اپنی پہچان قائم کر چکے تھے۔

جین صاحب کے اول ادبی کارنامے کے تینوں ایڈیشن خاں صاحب کی نظر سے گزر چکے تھے، تحقیق وتنقید کے میدان میں جین صاحب اپنے مطالعہ کے ذریعہ کافی آگے بڑھ چکے تھے۔ان کی

محنت ولگن سے متعلق خاں صاحب کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

''مسلسل مطالعے کی روشنی میں ترمیم، تصحیح اور اضافوں کے اسی عمل کا یہ نتیجہ ہے کہ آج تک اس کتاب کی حیثیت ''کتاب حوالہ'' کی سی ہے۔ جو شخص بھی داستانی ذخیرے کے کسی بھی حصے پر اور کسی بھی پہلو پر کوئی ڈھنگ کا کام کرنا چاہے گا، وہ اس کتاب سے استفادے پر اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔ مجھے اس کی حقیقی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوا تھا جب میں نے مختصر داستانوں (یا داستانی قصوں) میں سے فسانۂ عجائب، باغ و بہار اور گلزار نسیم کو مرتب کرنے کا خاکہ بنایا تھا اور پھر اس وقت جب ان کاموں کو شروع کیا گیا تھا، جن داستانوں پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے، ان کے سلسلے میں ایک اچھا اور مفید کام یہ کیا گیا ہے کہ داستانوں کے اصل مآخذ کا پتا لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض داستانوں کے مختلف اجزا کے سلسلے میں مزید معلومات مہیا کرنے کی گنجائش ہے، مگر اس سے اصل کام کی اہمیت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ تحقیق میں ہر کام کے سلسلے میں ترمیم، اضافے اور تصحیح کی کچھ نہ کچھ گنجائش رہتی ہے اور شاید ہمیشہ رہے گی۔ یہ تو تحقیقی عمل کا لازمی جز ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ جس وقت کوئی کام کیا گیا تھا، اس وقت تک حصول معلومات کے جو معلوم ذرائع تھے، ان سے پورے طور پر اور صحیح طور پر استفادہ کیا گیا یا نہیں اور اس اعتبار سے یہ کتاب تنقید اور تنقیح کی کسوٹی پر کھری اترے گی''۔ (''جین صاحب'' مشمولہ ''مقالات رشید حسن خاں'' غیر مطبوع جلد چہارم، ص ۴۱۳۔ ۴۱۴)

دونوں حضرات کی ادبی زندگی کی واضح تصویر کو سامنے لانے کے لیے ہم اپنی گفتگو کا رخ رشید حسن خاں صاحب کی طرف موڑتے ہیں۔ وہ ۲۵/ دسمبر ۱۹۲۵ء کو اتر پردیش کے ایک شہر شاہجہاں پور، یوسف زئی پٹھانوں کے ایک محلے باڑو زئی میں امیر حسن خاں کے ہاں اس فانی دنیا میں وارد ہوئے۔ امیر حسن کی چھ اولادوں میں ان کے علاوہ دو بھائی اور تین بہنیں اور تھیں۔ اس وقت کوئی بھی بہ قید حیات نہیں ہے۔

ابتدائی عربی و قرآن پاک کی تعلیم انہوں نے محلے کے مولوی صاحب سے حاصل کی جوان کے

والد کے بھی استاد رہ چکے تھے۔ اس کے بعد شاہجہاں پور کے مدرسہ بحر العلوم میں یہ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۹ء رہے۔ درس نظامی کی تعلیم کا سلسلہ حالات کی مجبوری کی وجہ سے منقطع کرنا پڑا اور شاہ جہاں پور کی آرڈی نینس فیکٹری میں انہیں بطور مزدور ملازمت کرنی پڑی۔ ۱۹۴۱ء میں یہ مزدور یونین کے جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء کے آخر میں مزدوروں کی ہڑتال کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے ساتھ انہیں بھی نکال دیا گیا۔ کچھ عرصہ بیکار رہے، اس کے بعد انہیں شہر کے عربی مدرسہ فیض عام میں عربی و فقہ کی ابتدائی کتابوں کا درس دینے کے لیے استاد مقرر کیا گیا، یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ اس سے قبل تین ساڑھے تین سال کا وقت انہوں نے بریلی میں گزارا۔

۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۲ء یہ اسی مدرسہ میں رہے۔ اسی دوران انہوں نے یوپی کے عربی و فارسی بورڈ سے مولوی کا اور لکھنؤ یونیورسٹی کے اورینٹل ڈپارٹمنٹ سے دبیر کامل کا امتحان امتیاز سے پاس کرلیا۔ ۱۹۵۲ء کے وسط میں یہ اسلامیہ ہائرسکنڈری اسکول شاہ جہاں پور میں اردو و فارسی کے استاد مقرر ہوئے، یہاں یہ اگست ۱۹۵۹ء تک رہے، ۱۹۵۰ء سے قبل انہوں نے تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھنے شروع کر دیے تھے، جو ملک کے مقتدر رسائل میں چھپنے شروع ہو گئے تھے۔ اپنے خط مرقومہ ۸/ جون ۲۰۰۵ء کو شاہجہاں پور سے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور، پاکستان) کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

> ”یہ آپ کیا لے کر بیٹھ گئے! میرے پرانے مضامین کا کیا ہوگا؟ ان میں سے بیشتر تو گویا ”دور جاہلیت“ کی پیداوار ہیں، اب انہیں بھول جانا ہی بہتر ہے۔ ہاں ۶۰ء کے بعد کے کچھ مضامین ہیں جو چھپ سکتے ہیں، مگر اب طبیعت ادھر نہیں آتی۔ میرے پاس بعض مضامین نہیں، ان میں قابل ذکر ہے ”شبلی کی فارسی شاعری“، جو نگار میں چھپا تھا، غالباً ۵۵ء سے پہلے صحیح زمانہ یاد نہیں۔ اب اسے پھر سے لکھنا دردسر ہے، یوں کبھی سوچا نہیں، آپ بھی ان کو بھول جائیے اور بھی کام زمانے میں ہیں۔ ۵۰ء سے پہلے کے بھی ایک یا دو مضمون تھے، مگر اب ان کا وجود نہ میرے ذہن میں ہے اور نہ کاغذ پر۔ معلوم نہیں کیا ہوئے۔ ہاں اتنا یاد ہے (مبہم سا) کہ احمد ندیم قاسمی کے مجموعہ ”قطعات رِم جھم“ پر ایک تبصرہ تھا“۔ (”مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی“ مرتبہ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ادبیات رحمان مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور،

اشاعت جون ۲۰۰۹ء، ص ۱۶۰۔۱۵۸)

مضمون ''شبلی کی فارسی شاعری'' کا اصل عنوان ''شبلی کا فارسی تغزل'' ہے، یہ مضمون مئی ۱۹۵۵ء نگار کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ (یہ مضمون راقم کی مرتبہ کتاب ''مقالات رشید حسن خاں'' کی جلد اول کا پہلا مضمون ہے، جو اشاعت اول ۲۰۱۶ء، اپلائڈ بکس، نئی دہلی۔۲ کے ص ۵۳ تا ۷۰ پر محیط ہے)۱۹۵۰ء سے قبل کا ایک مضمون ''لغت اور استعمال عام'' جو ''الحمرا'' لاہور میں شائع ہوا تھا۔ وہ بھی ''مقالات رشید حسن خاں'' کی جلد اول اشاعت ۲۰۱۶ء میں شامل ہے۔ راقم مقالات رشید حسن خاں کی مزید تین جلدیں مرتب کر چکا ہے جن کی ضخامت ۵۴۴، ۵۳۶ صفحات سے کم کی نہیں ہے اور یہ زیر طبع ہیں۔ صرف ''قطعات رم جھم'' والا تبصرہ ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔

ان شواہد سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء سے قبل ہو چکا تھا اور ادبی حلقوں میں ان کے نام اور مضامین کے چرچے ہو رہے تھے۔ جس کی وجہ سے خواجہ احمد فاروقی صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی نظر انتخاب ان پر پڑی اور خواجہ صاحب انہیں اپنے شعبے میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر اگست ۱۹۵۹ء میں لے آئے۔ (''ممتاز محقق اور متنی نقاد: رشید حسن خاں'' از ڈاکٹر خلیق انجم، مشمولہ ہفت روزہ ''ہماری زبان''، رشید حسن خاں نمبر، یکم تا ۲۸ ستمبر ۲۰۰۶ء، جلد ۶۵، شمارہ ۳۳ تا ۳۶، ص ۴)

دہلی یونیورسٹی میں آنے کے بعد بھی ۱۹۶۳ء تک خاں صاحب نے کسی کتاب پر مسلسل کام نہیں کیا۔ ہاں مضامین وہ برابر لکھتے رہے اور ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ انہوں نے سب سے پہلے داستان باغ و بہار پر ۱۹۶۳ء میں کام شروع کیا اور یہ ۱۹۶۴ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی کے معیاری ادب کے سلسلے کے تحت شائع ہوئی، مگر یہ اپنے اس کام سے مطمئن نہیں ہوئے اور انہوں نے اس پر مزید کام کرنا شروع کر دیا۔ ۲۸ برس بعد یہ داستان بیک وقت انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی اور انجمن ترقی اردو لاہور، پاکستان سے شائع ہوئی۔

باغ و بہار کے علاوہ انہوں نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی کے لیے چند اور کتابیں مرتب کیں جن کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے:

انتخاب نظیر اکبرآبادی (۱۹۷۰ء)۔ انتخاب مضامین شبلی (۱۹۷۱ء)۔ انتخاب مراثی انیس و

دبیر (۱۹۷۱ء)۔ دیوان خواجہ میر درد (۱۹۷۱ء)۔ انتخاب سودا (۱۹۷۲ء)۔ انتخاب ناسخ (۱۹۷۲ء)۔

رشید حسن خاں صاحب کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "اردو املا" (۱۹۷۲ء) جو ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سے منظر عام پر آیا۔ انجمن ترقی اردو (ہند)، غالب بھون نئی دہلی، فروغ اردو کونسل نئی دہلی، اندرون ملک کے دوسرے علمی و ادبی اداروں کے علاوہ انجمن ترقی اردو کراچی (پاکستان) کے تحت جو کتابیں شائع ہوتی ہیں، ان کے املا میں اس کتاب میں بتائے ہوئے اصولوں کی پیروی کی جاتی ہے۔ انجمن ترقی اردو کراچی (پاکستان) سے جو بائیس جلدوں میں اردو لغت شائع ہوا ہے، اس میں اردو املا میں بتائی ہوئی جدید املائی تبدیلیوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔

درج ذیل تاریخی ترتیب سے ان کتابوں کے نام لکھے جاتے ہیں:

اردو کیسے لکھیں (مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۵)۔ زبان اور قواعد (لغت، تلفظ اور قواعد شاعری) (ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۷۶ء)۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ (ایجوکیشن بک ہاؤس، ۱۹۷۸ء)۔ تلاش و تعبیر (تنقیدی مضامین) (دہلی اردو اکادمی ۱۹۸۸)۔ فسانۂ عجائب (تدوین) (انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی اور انجمن ترقی اردو لاہور، پاکستان ۱۹۹۰ء)۔ باغ و بہار (تدوین) (انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی اور انجمن ترقیاردو لاہور، پاکستان ۱۹۹۲ء)۔ تفہیم (تنقیدی اور تحقیقی مضامین) (جامعہ نئی دہلی ۱۹۹۳ء)۔ انشا اور تلفظ (جامعہ نئی دہلی ۱۹۹۴ء)۔ عبارت کیسے لکھیں (جامعہ ۱۹۹۴ء)۔ انشائے غالب (جامعہ ۱۹۹۴ء)۔ مثنوی گلزار نسیم (تدوین) (انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ۱۹۹۵ء)۔ انتخاب کلام ناسخ (کراچی، پاکستان ۱۹۹۶ء)۔ مثنویات شوق (تدوین) (انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی اور انجمن ترقی اردو لاہور، پاکستان ۱۹۹۹ء)۔ تدوین، تحقیق، روایت (دہلی ۱۹۹۹ء)۔ مثنوی سحر البیان (تدوین) انجمن دہلی ۲۰۰۰ء)۔ املائے غالب (دہلی ۲۰۰۱ء)۔ مصطلحات ٹھگی (تدوین) انجمن دہلی ۲۰۰۲ء)۔ کلیات جعفر زٹلی (تدوین) (انجمن دہلی ۲۰۰۳ء)۔ کلاسیکی ادب کی فرہنگ (جلد اول) (انجمن ترقی ۲۰۰۳ء)۔ گنجینۂ معنی کا طلسم (جلد اول، غالب بھون، نئی دہلی ۲۰۱۷ء)۔ غرائب اللغات اور کلام اقبال کی تدوین کے کام ادھورے رہ گئے۔

رشید حسن خاں صاحب نے ۱۹۵۰ء سے قبل لکھنا شروع کر دیا تھا۔ شاہ جہاں پور سے اپنے ایک خط مرقوم ۲ رمئی ۲۰۰۵ء بنام پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور) کو یوں لکھتے ہیں:

"جس اردو کانفرنس کی بابت آپ نے پوچھا ہے، جی ہاں ان دنوں میں "لکھنا لکھانا" شروع کر چکا تھا۔ میرا پہلا مضمون احمد ندیم قاسمی صاحب کے مجموعے "رم جھم" (شاید یہی نام تھا) پر شاعر (آگرہ) میں شائع ہوا تھا"۔ (مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتبہ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ادبیات، رحمان مارکیٹ غزنی اسٹریٹ، اردو بازار لاہور، ص ۱۵۵، اشاعت اول جون ۲۰۰۹ء)

انہی دنوں سے انہوں نے اردو املا سے متعلق مواد جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ پہلی اردو املا کمیٹی کا اجلاس جنوری ۱۹۴۴ء میں ناگپور میں منعقد ہوا تھا۔ کمیٹی نے اسی میں اردو املا کی تبدیلی سے متعلق اپنی سفارشات پیش کی تھیں۔ مگر عرصہ دراز تک ان پر عمل نہیں ہوا۔ آزادی سے قبل و آزادی کے بعد تک کی جتنی تحریریں جن حضرات کی املا سے متعلق مختلف رسائل میں شائع ہوئی تھیں، خاں صاحب کے کام کی بنیاد یہی ثابت ہوئیں۔

ان کا اردو املا سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"مجھے سب سے پہلے مرحوم (ڈاکٹر عبدالستار صدیقی) ہی کے مضامین سے املا کے مسائل سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ۱۹۶۰ء کے اوائل میں میں نے یہ طے کیا کہ اس موضوع کی طرف باقاعدہ توجہ کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں نے یہ کوشش کی کہ مختلف رسالوں اور کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو دیکھا جائے۔ مطالعے کے دوران میں اندازہ ہوا کہ یہ موضوع واقعتاً وسیع ہے اور قاعدوں کے مرتب نہ ہونے سے انتشار اور غلط نویسی جس قدر پھیل چکی ہے، اس کا احاطہ کرنا کچھ آسان نہیں۔ میں نے سب سے پہلے انجمن ترقی اردو (مرحوم) کی ان تجاویز اصلاح املا کو سامنے رکھا، جو رسالہ اردو میں شائع ہوئی تھیں۔ یہ دراصل اس اصلاح املا کمیٹی کی رپورٹ ہے، جو ۱۹۴۳ء میں مقرر کی گئی تھی۔ ان تجاویز کو میں نے اپنے کام کی بنیاد بنایا"۔ (اردو بورڈ کی کتاب اردو املا رشید حسن خاں نیشنل اکاڈمی، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۱۱۰۰۰۶، مئی ۱۹۷۴ء، پہلی بار دو ہزار، ابتدائیہ ص ۳۵۔۳۴)

خاں صاحب نے مولانا احسن مارہروی کے رسالہ فصیح الملک (۱۹۰۵ء)، ڈاکٹر غلام مصطفی

خاں کی کتاب علمی نقوش، رسالہ ہندوستانی، رسالہ اردو، رسالہ معیار (پٹنہ)، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، آقاے احمد بہمنیار کا گراں قدر مقالہ جو لغت نامہ دہخدا کے چالیسویں حصہ میں شامل ہے، فرہنگ آصفیہ، نور اللغات کی آٹھوں جلدوں، مجلہ اردو نامہ (کراچی) کے علاوہ متعدد اساتذہ کے مکاتیب اور رسائل اور قواعد صرف ونحو کی بعض کتابوں کو بھی پیش نظر رکھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر شوکت سبزواری، جناب حیات اللہ انصاری اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے متعدد مقالوں سے استفادہ کیا۔ خاں صاحب نے انھی حضرات کی تحریروں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ زبان کے آغاز سے ہی استاد شعرا نے اس مسئلے پر گاہے گاہے جو تذروں ولغات میں درج کیا اسے بھی سامنے رکھا۔

رشید حسن خاں صاحب کا اردو املا پر کام کرنے سے قبل ڈاکٹر گیان چند جین بھی املا کے مسئلے سے متعلق اپنے مضامین میں گفتگو کر چکے تھے، لیکن املا یا اردو رسم الخط سے متعلق اس وقت تک ان کی کوئی مستقل کتاب سامنے نہیں آئی تھی۔

عام لسانیات، لسانی رشتے اور لسانی مطالعے میں جین صاحب نے اردو زبان کے آغاز کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں سے اس کے رشتے سے متعلق کھل کر بات کی ہے۔ وہ کھڑی بولی کو اس کی بنیاد مانتے ہیں۔ وہ اس کی کڑیوں کو اپ بھرنش و سنسکرت سے ہوتے ہوئے ویدک زبان تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس زبان کو عربی و فارسی یعنی اردو رسم الخط میں ہی لکھنے کی وکالت کرتے ہیں۔ وہ اس زبان کو لکھنے کے لیے اپنی ابتدائی تعلیم سے زندگی کے آخری ایام تک اسی خط کو اپنائے رہے۔ ہاں کسی زمانے میں وہ اس رسم الخط کو بدلنے کے حق میں تھے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ اس زبان میں کچھ ہم اصوات حروف ہیں جن کی ادائیگی میں تو کوئی فرق نہیں لیکن تحریری صورت میں واضح فرق ہے۔

اردو املا میں رشید حسن خاں صاحب نے ان ہم اصوات حروف پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہم ایسے حروف کو الگ نہیں کر سکتے۔ انھی حروف کی وجہ سے ہمارے ادب کا بڑا ذخیرہ لغات اور کتب میں محفوظ ہے۔

خاں صاحب جین صاحب کو ماہر لسانیات مانتے ہیں اور وہ اس بات کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''انہوں نے لسانیات سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ میں لسانیات کا مرد میدان نہیں۔ اس لیے اس موضوع سے تعلق رکھنے والی تحریروں کے متعلق کوئی رائے تو نہیں دے سکتا، مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ایک ایسے عام قاری کے طور پر، جس کو زبان اور قواعد زبان کے مسائل سے دلچسپی ہے، جب بھی میں نے ان کی کوئی تحریر پڑھی ہے، خاص کر ان کی کتاب لسانی مطالعے، تو مجھے اس کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ لسانیات سے متعلق مباحث کو انہوں نے دوسروں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے نہیں بلکہ سمجھنے سمجھانے کی غرض سے لکھا ہے، اسی انداز سے بحث کی ہے۔ وہ اپنے آپ کو (بے تہ افراد کی طرح) مدعیانہ تحریروں کی مدد سے اس فن کا ماہر نہیں منوانا چاہتے۔ اس کے برخلاف وہ ضروری اور اہم مسائل پر سلجھی ہوئی گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی ایسی تحریروں کو پڑھ کر یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ ہم انگریزی کے ترجمے پڑھ رہے ہیں، یہ وجہ بھی ہے کہ ان کی باتیں اچٹتی ہوئی نہیں ہوتیں۔ ان کی ایسی تحریریں پڑھ کر واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ صرف ''ماہر لسانیات'' ان کے مخاطب ہیں، وہ سب لوگ ان کے مخاطب ہیں جو لسانی مسائل سے اور زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں اور جو لسانی اصول و قواعد سے بخوبی واقف ہیں اور زبان و قواعد زبان کے متعلقات کو مبینہ ماہر لسانیات کے مقابلے میں بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں''۔ (جین صاحب از رشید حسن خاں، ماہنامہ آج کل، نئی دہلی، اپریل ۱۹۹۹ء، ص ۸ تا ۱۱، مشمولہ ''مقالات رشید حسن خاں'' جلد چارم، غیر مطبوعہ، ص ۴۱۱ تا ۴۲۱)

مذکورہ بالا اقتباس میں خاں صاحب نے بڑے خوبصورت انداز میں جین صاحب کی لسانی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی ان ماہر لسانیات پر چوٹ کی ہے جنھوں نے پوری کتابوں کے ہو بہ ہو ترجمے کیے ہیں اور دوسروں پر رعب جمانے اور اپنی علمیت کا سکہ بٹھانے کی خاطر بڑی بڑی مشکل اصطلاحوں کا سہارا لیا ہے۔

خاں صاحب کا یہ جملہ خاص طور سے قابل غور ہے۔ ''وہ اپنے آپ کو (بے تہ افراد کی طرح)

مدعیانہ تحریروں کی مدد سے اس فن کا ماہر نہیں منوانا چاہتے‘‘۔

خاں صاحب نے اپنے لیے لکھا ہے کہ ’’میں لسانیات کا مرد میدان نہیں‘‘۔ یہ بات درست نہیں بلکہ جین صاحب کی علمیت کے سامنے یہ ان کی انکساری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ وہ جین صاحب کے قدرداں تھے۔

اگر خاں صاحب لسانیات کے علم سے واقف نہ ہوتے تو وہ علی گڑھ تاریخ ادب، اردو پاکستان کے معروف قلم کار جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو اور پاکستان کے ہی شیخ محمد اکرام صاحب کی مرتب کی ہوئی کتاب ثقافت پاکستان پر کبھی قلم اٹھانے کی جرأت نہ کرتے۔ لسانیات کے علم کے جانے بغیر کسی بھی زبان کے ادب کی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔ ان شواہد سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ خاں صاحب صرف تحقیق، تنقید اور تدوین کے میدان کے ہی مرد نہیں تھے وہ لسانیات کے علم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔

یہ بات درست ہے کہ رشید حسن خاں صاحب نے لسانیات پر کوئی مستقل کتاب تحریر نہیں کی لیکن جین صاحب ہی کی طرح انہیں لسانیات پر اچھا خاصا عبور تھا۔ انھوں نے اپنے خیالات کو مختلف اوقات میں مضامین کی صورت میں پیش کیا ہے۔

جین صاحب نے کھڑی بولی کو اردو کی بنیاد قرار دیتے ہوئے اس کی کڑیاں اپ بھرنش، سنسکرت اور رگ وید سے جاملائی ہیں۔ اسی روشنی میں رشید حسن خاں صاحب کے خیالات ہندوستانی فارسی سے متعلق سنیے۔ وہ اسے اصل فارسی مانتے ہیں جبکہ تہرانی فارسی کو اصل زبان نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندوستانی فارسی کی جڑیں تہران میں نہیں بلکہ کسی اور مقام سے جڑی ہوئی ہیں۔ یہ بات سن کر موجود ماہرین لسانیات کے ماتھے پر ضرور بل پڑ سکتے ہیں۔

اب راقم چند باتوں کی طرف توجہ منعطف کروانا چاہتا ہے جن کا ذکر خاں صاحب نے اپنے ایک مضمون بعنوان ’’ہندوستانی فارسی میں تلفظ اور املا کے بعض مسائل‘‘ میں کیا ہے۔ شروع کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ’’یائے مجہول اور واو مجہول کی آوازیں دو قدیم ہند ایرانی مصوّتے ہیں۔
> ہندوستان میں یہ آوازیں یہاں کے نظام صوتیات کا جز ہیں۔ ایرانی لہجے میں بھی یہ

آوازیں موجود تھیں، لسانیات کی زبان میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ آوازیں فارسی صوتیات کا حصہ تھیں۔ فارسی کی مختلف کتابوں میں، خاص کر علم قافیہ اور صرف ونحو سے متعلق کتابوں میں عام طور پر ان کی صراحت ملتی ہے۔ یہی حال نون غُنّہ کی آواز کا ہے، مگر کچھ مدت سے، مختلف اسباب کی بنا پر (جن میں سے بعض سبب سیاسی بھی ہیں)۔ ایران کے مرکزی لہجے میں مجہول اور غُنّہ آوازیں باقی نہیں رہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ فارسی کا (یا یوں کہیے کہ جدید فارسی کا) ایرانی معیاری لہجہ وہ ہے جو تہران میں رائج ہے اور وہ ان آوازوں سے خالی ہے"۔ (تفہیم، رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، پہلی بار دسمبر ۱۹۹۳ء، ص ۱۴۲)۔

یہ قانون قدرت ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز تغیر پذیر ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ان میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور یہی قانون اس کرۂ ارض کی عام زبانوں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ لسانی تاریخ ان باتوں کی شواہد ہے کہ ہر زبان کے حروف، تلفظ اور املا میں دھیرے دھیرے بدلاؤ ہوتا ہے، جس کا احساس فوراً نہیں ہوتا۔

ہندوستان میں جب بھی کوئی کلاسیکی ادب کا مطالعہ کرے گا یا کسی متن کو مرتب کرے گا اس کا واسطہ تذکروں سے پڑے گا اور یہ زیادہ طرح فارسی میں ہیں۔ ان دونوں کاموں کے لیے صوتیاتی اور لسانیاتی نظام کے اصولوں کو نظر میں رکھنا ہوگا۔ خاں صاحب لکھتے ہیں:

"کلاسیکی فارسی میں غُنّہ اور مجہول آوازیں موجود تھیں۔ لغت اور قواعد کی کتابوں میں التزام کے ساتھ ان کا ذکر کیا جاتا تھا۔ مثلاً قواعد کی مشہور ترین قدیم کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم کو لیجیے، جس کے ایرانی مصنف نے شیخ سعدی کا زمانہ پایا تھا۔ اس کتاب میں حروف قافیہ کی بحث میں یائے معروف ومجہول اور واو معروف ومجہول کی تفریق کو دیکھا جاسکتا ہے"۔ (ایضاً، ص ۱۴۳)

خاں صاحب نے قوافی کے بیان، حرف نکرہ اور حرف شرط و جزا، کے سلسلے میں طویل اقتباس درج کیے ہیں۔ ہم صرف انوری کے دو اشعار پر اکتفا کریں گے:

بذیں دو روزہ توقف کی لوک خود بنود　　دریں مقام فسوس و دریں سرای فریب

جدا قبول کنم از کسی آنچ عاقبتش ز خلق سرزنشم باشد از خدای عتیب

اس سے قطعی طور پر تائید ہوتی ہے دو باتوں کی، ایک تو یہ کہ "فریب" میں یاے مجہول ہے (جسے مصنف "یاے ملنیّہ" کہتا ہے) دوسرے یہ کہ جن لفظوں میں امالہ ہوتا ہے، ان میں یاے مجہول الف کی جگہ لیتی ہے، جیسے "عتاب" امالے کے بعد "عتیب" بنا ہے.......... براہین العجم کے مصنف سپہر کاشانی نے نہایت سختی کے ساتھ اس کی ہدایت کی ہے کہ جن لفظوں میں امالہ ہو، ان کو ایسے لفظوں کے ساتھ ہم قافیہ نہیں کرنا چاہیے جن میں یاے معروف ہو، اس بنا پر کہ امالے والے لفظوں میں یائے مجہول ہوتی ہے۔ یعنی "عتیب" کو "فریب" کا ہم قافیہ تو بنایا جاسکتا ہے مگر "حبیب" یا "نصیب" کا ہم قافیہ نہیں کیا جاسکتا"۔ (ایضاً ص ۱۴۵)

رشید حسن خاں کے لسانی مطالعے کی داد دیجیے کہ وہ زمانہ حال کے ایک مشہور ایرانی فاضل جلال الدین ہمائی کے ایک مقالے "دستور زبان فارسی" کا حوالہ دے رہے ہیں، جو مشہور لغت نامہ دہخدا میں شامل ہے، جس میں انہوں نے ذکر کیا ہے کہ "مجہول آوازیں فارسی زبان کا جز ہیں، جواب بھی بعض لہجوں، خاص کر کردوں کے لہجے میں موجود ہیں۔ مقالہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ دو الگ الگ آوازیں ہیں جو "مختصات زبان فارسی" میں شامل سمجھی جاتی ہیں اور شامل سمجھی جانا چاہیے"۔ (ایضاً، ص ۱۴۶)

یہ بات اردو والے بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ واو اوری معروف یا مجہول ہونے کے لحاظ سے ان کے استعمال سے معنوی فرق پیدا ہوتا ہے، تلفظ اور کتابت کی صورت میں بھی۔

اس بات کو مشہور ایرانی فاضل بہار نے تسلیم کیا ہے کہ ہندوستانی معروف و مجہول اور غُنّہ آوازوں کے فرق کو تلفظ اور کتابت میں برقرار رکھتے ہیں۔ اپنی کتاب سبک شناسی میں لکھتا ہے:

"در رسم الخط ہند دو نکتہ وجود داشتہ و دارد، کہ در ایران بے سابقہ است، و گویا
در خراسان قدیماً بودہ است و بہ عراق سرایت نہ نمودہ، و آن معین کردن نون غنّہ و
یاء مجہول است در کتابت"۔ (جلد سوم، ص ۳۰۸)۔ (ایضاً ص ۴۹۔۴۸)

خاں صاحب نے اسی مضمون میں ڈاکٹر شوکت سبزواری (مرحوم) کے مقالے "دو ہندا ایرانی مصوّتے اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی (مرحوم) کے مقالے "فارسی کا ہندوستانی لہجہ" کا حوالہ دیا ہے جو ارمغان مالک کی جلد اول و دوم میں شامل ہیں کہ ان میں تفصیل سے ان اصوات کا ذکر ہے۔

فرہنگ جہاں گیری ہو یا برہان قاطع یا لغت چراغ ہدایت، یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ معروف ومجہول اور غنّہ آوازیں قدیم فارسی کا جز تھیں اور کردستان اور ہندوستان میں وہ اب تک موجود ہیں اور لہجے کا جز ہیں۔

خاں صاحب کو صرف لسانی وصوتی نظام کا ہی علم نہیں تھا بلکہ وہ ماہر عروض بھی تھے۔ گیان چند جین صاحب نے علم عروض پر باقاعدہ ایک کتاب بعنوان ''اردو کا اپنا عروض'' عام فہم اور سادہ زبان میں لکھی جس کے مطالعہ سے عام قاری آسانی سے اس کے اصول سیکھ سکتا ہے۔ مگر خاں صاحب نے ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ البتہ عروض سے متعلق انہوں نے مختلف اوقات میں مضامین ضرور لکھے، جو مختلف رسائل میں بکھرے پڑے تھے۔ راقم نے انہیں یکجا کر کے چار جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ جن میں سے جلد اول ۵۴۸ صفحات پر مشتمل ۲۰۱۶ء میں شائع ہو چکی ہے اور اتنی ہی ضخامت کی تین اور جلدیں زیر طبع ہیں۔ ان کے عروضی علم سے متعلق تفصیل سے گفتگو آگے آئے گی۔ یہاں اس وقت اس بات کا ذکر کرنا ہے کہ بقول خاں صاحب:

> ''عروض کے قاعدے کے مطابق تقطیع میں نون غنہ ساقط ہو جایا کرتا ہے اور اس پر ایرانی اور ہندوستانی قواعد نویسوں کا اتفاق ہے۔ مثلاً ''جہان'' جب فارسی ترکیب کے ساتھ آئے گا، جیسے رنگ جہاں، تو آخر کا نون غنہ ہوگا پڑھنے میں بھی اور لکھنے میں بھی۔ اس بنا پر ''جہاں'' جو ویسے چار حرفی لفظ ہے، تقطیع شعر میں ''جہا'' (بروزن فعل) تین حرفی رہ جائے گا۔ اسے اگر ''جہان'' (مع نون نقطہ وار) لکھا جائے اور جدید ایرانی لہجے کے مطابق ''جہن'' پڑھا جائے تو یہاں قاعدہ ہی چوپٹ ہو جائے گا، اس بنا پر کہ ایسا کوئی قاعدہ نہیں کہ ''جہاں'' کو ''جہن'' پڑھ کر درمیان کے الف کو ساقط فرض کر لیا جائے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے لیے ایک ہی قاعدہ تھا اور ہے کہ نون غنہ جب آخر لفظ واقع ہوگا تو اسے تقطیع میں ساقط کر دیا جائے گا''۔
>
> (ایضاً، ۱۶۳)

قواعد عروض کی معتبر کتاب معیار الاشعار میں ان حروف کا تفصیل سے ذکر موجود ہے جو تقطیع میں ساقط ہو جاتے ہیں۔ فارسی میں نون غنہ اور اردو میں ہائے مخلوط (ھ) وزن عروض میں شامل نہیں ہوتے۔

گذشتہ صفحات میں اس بات کا ذکر آیا تھا کہ خاں صاحب تہرانی فارسی کو اصل فارسی نہیں مانتے، اس بات کو درج ذیل اقتباس کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں اور خاں صاحب کے لسانی علم پر غور کریں:

''جو لوگ آج اس پر اصرار کرتے ہیں کہ خسرو سے لے کر اقبال تک کے کلام کو جدید ایرانی لہجے میں پڑھا جائے اور اسی کے مطابق لکھا جائے، وہ لوگ غالباً زبان کی تاریخ سے کم آشنا ہیں اور اس سلسلے میں اب تک ایران اور ہندوستان میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو بھی یا تو انہوں نے پڑھا ہی نہیں یا توجہ کے ساتھ نہیں پڑھا۔ یہ بات ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ ہندوستان میں فارسی تہران کے راستے سے نہیں آئی تھی، ماوراءالنہر اور خراسان کے راستے سے آئی تھی اور ان دونوں علاقہ کا لہجہ معروف و مجہول آوازوں کے لحاظ سے وہی تھا جو ہندوستان کا تھا۔ خاص کر خراسان میں (جو زبان و ادب کا اولین مرکز تھا) مجہول آوازیں موجود تھیں۔ جب فارسی زبان ہندوستان میں آئی تو ان آوازوں کو ساتھ لے کر آئی اور حسن اتفاق سے یہ آوازیں یہاں پہلے ہی سے موجود تھیں اور یوں اس حد تک لہجے کی یکسانی نے ان آوازوں کو فارسی زبان کا جز بنائے رکھا۔

ایران میں سیاسی حالات نے (خاص کر حملۂ مغول نے) پہلے خراسان سے مرکزیت چھینی اور اسے پہلے شیراز کے اور پھر اصفہان کے حوالے کیا اور آخر میں یہ شرف تہران کے حصے میں آیا۔ سیاسی مرکزیت کے خاتمے نے ادبی مرکزیت کا شرف بھی خراسان سے چھین لیا تھا، یوں خراسانی لہجہ اپنے آپ کو برقرار نہیں رکھ سکا اور دیگر مختلف حالات کے اثر سے بھی رفتہ رفتہ مجہول اور غنہ آوازیں تحلیل ہونے لگیں لیکن کم از کم عہد سعدی تک شیرازی لہجے میں مجہول آوازیں موجود تھیں (سبک شناسی) یہاں تک کہ تہران کی سیاسی مرکزیت نے اسے ادبی مرکزیت بھی عطا کر دی اور یوں تہرانی لہجہ معیار اور مثال کے طور پر چھانے لگا اور چھا گیا۔ مگر ہندوستان میں ایسی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی جو ایران کی طرح کے لہجے پر اثر انداز ہوتی، یہاں وہی لہجہ برقرار ہے جو غزنوی اور خلجی دور میں تھا''۔ (ایضاً ص ۶۷۔۱۶۶)

یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ ہندوستانی فارسی کی جتنی کتابیں ایران میں شائع ہوئیں ان میں جدید ایرانی تلفظ، املا اور لہجے کو اختیار کیا گیا ہے، جس سے ان کی اصل صورت ہی بدل گئی ہے۔ متن منشائے مصنف کے بالکل خلاف نظر آتا ہے۔اس کی عمدہ مثال ہے ہندوستان میں عہد اورنگ زیب عالمگیر میں لکھی گئی کتاب ''تحفۃ الہند'' جسے ایران کے مشہور اشاعتی ادارے بنیاد فرہنگ نے چھاپا ہے۔ انہوں نے اس کا املا ہی بدل کر رکھ دیا ہے جس سے معنی و مطلب میں بہت زیادہ فرق آ گیا ہے۔

یہ بات ماہر لسانیات بہتر جانتے ہیں کہ لہجہ اور املا دو مختلف چیزیں ہیں۔لفظ کا املا صحیح طور پر لکھا جانا چاہیے اور اسے پڑھنے والے پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ اپنے لہجے کے مطابق اسے کس طرح پڑھتا ہے۔

ہندوستان دنیا میں واحد ایسا ملک ہے جس میں فارسی کو غیر ملکی زبان کے طور پر نہیں بلکہ علمی و تہذیبی حیثیت کے طور پر پڑھا جاتا رہا ہے، جب ایرانی دربار میں ترکی کو افضلیت حاصل تھی، ہندوستان میں تب بھی فارسی درباری اور سرکاری مرتبہ حاصل کیے ہوئے تھی۔جتنی کتابیں ولغت یہاں مرتب ہوتے تھے وہ اصل لہجے و املا کے مطابق ہوتے تھے۔ہندوستانی فارسی زبان سے متعلق خاں صاحب کی ان باتوں پر ذرا غور کیجیے ''ہندوستان میں بہ ہر طور فارسی مشرقی ایران سے آئی تھی اور اپنے لہجے کو ساتھ لے کر آئی تھی، یہ لہجہ ہندوستانی لہجے سے مطابقت رکھتا تھا، یوں یہاں شروع سے آج تک خراسانی لہجے کی اصل حیثیت حاصل رہی''۔(ایضاً،ص ۱۷۲)

اتنی طویل گفتگو کے بعد شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ خاں صاحب لسانیات کے علم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، گو انہوں نے گیان چند جین صاحب کی طرح لسانیات کے موضوع سے متعلق کوئی کتاب مرتب نہیں کی اور نہ ہی وہ ماہر لسانیات کے طور پر مشہور ہوئے۔

گیان چند جین اور رشید حسن خاں کا بحیثیت محقق ادبی رشتہ کیا ہے؟

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں شخصیات تحقیق کے میدان کے مرد ہیں۔جین صاحب نے اس میدان میں خاں صاحب سے پہلے قدم رکھا۔انہوں نے ۱۹۴۵ء میں اردو میں ایم۔اے کیا اور اسی سال انہوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی میں ڈی۔فل میں داخلہ لیا۔ان کا تحقیقی موضوع تھا ''اردو کی نثری داستانیں''، ۱۹۴۸ء میں انہیں اسی موضوع پر ڈگری تفویض ہوئی۔اس کے بعد مسلسل اس

میدان میں آگے بڑھتے رہے، زندگی کے آخری ایام تک۔

۱۹۸۰ء تک جین صاحب کے ذہن میں تحقیق کے نقوش سے متعلق کوئی واضح تصویر نہیں تھی۔ اس کا اعتراف انہوں نے اپنی کتاب ''تحقیق کا فن'' کے ''پیش گفتار'' کے صفحہ ۱۱ پر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''میں نے ۱۹۸۰ء میں مرکزی یونیورسٹی حیدرآباد کے لیے ایم۔فل کا نصاب بنایا تو ایک پرچہ طریق تحقیق کا رکھا۔ کئی دوسری مرکزی یونیورسٹیوں میں ایم۔فل میں اس عنوان کا پرچہ تھا لیکن کسی میں مطالب کی تفصیل نہ تھی۔ میں نے مفصل نصاب بنایا، حوالے کی کتابیں درج کیں جن میں کئی انگریزی کتابیں تھیں۔ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ان انگریزی کتابوں میں سے ایک بھی نہیں دیکھی تھیں، ۱۹۸۰ء سے ایم فل کو اس پرچے کا درس دیتے دیتے میرے ذہن میں یہ موضوع صاف ہو گیا''۔
> (قومی اردو کونسل کی پہلی اشاعت ۲۰۰۸ء، اصل میں یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی سے ۱۹۹۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی)

جین صاحب نے ۱۹۸۶ء میں اس موضوع پر کام کرنا شروع کیا۔ ۱۹۸۷ء میں یہ مکمل ہوا اور ۱۹۹۰ء میں یہ کارنامہ منظر عام پر آیا۔ ۱۹۸۶ء کے دوران انہوں نے اردو، ہندی اور انگریزی میں جتنی کتابیں و مضامین چھپ چکے تھے ان کا بغور مطالعہ کیا اور کھلے دل سے ''پیش گفتار'' میں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔

دوسرے حضرات اور ان کی کتب کا ذکر کرتے ہوئے رشید حسن خاں صاحب سے متعلق یوں لکھتے ہیں:

> ''رشید حسن خاں کے مجموعۂ مضامین ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' میں بھی تحقیق اور اس کی شاخ تدوین کے بارے میں مفید مشورے ملتے ہیں''۔ (ایضاً، ص ۱۲)

رشید حسن خاں صاحب کی یہ کتاب پہلی بار ایجوکیشن بک ہاؤس سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کا ابتدائیہ خاں صاحب کے قلم سے ۱۵؍جون ۱۹۷۸ء کا لکھا ہوا ہے۔ دوسری مرتبہ یہ مجموعہ اتر پردیش اردو اکادمی سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس کا ''پیش لفظ'' محمد یونس نگرامی، چیئرمین مجلس

انتظامیہ، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۹۰ء کا ہے۔ اس مجموعے کا پہلا عنوان ہے ''کچھ اصول تحقیق کے بارے میں''۔

خاں صاحب نے براہ راست کسی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی تھی۔ لیکن برصغیر ہندو پاک کی یونیورسٹیوں میں انہیں لکچر دینے کے لیے دعوت دی جاتی رہی۔ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں انہیں ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات کا ممتحن بنایا جاتا رہا۔ اس کے علاوہ خاں صاحب کو اردو املا، قواعد زبان وشاعری، اصول تحقیق وتدوین، مشرقی شعریات، کلاسیکی ادب کی فرہنگ، تفہیم، تصوف، علوم بلاغت، متن کی قرأت اور لغت کی ترتیب وتدوین پر بھی لکچر دینے وورک شاپس منعقد کرنے کے لیے خاص طور سے مدعو کیا جاتا رہا۔ برصغیر ہندو پاک میں منعقد ہونے والے قومی و بین الاقوامی سمیناروں میں بھی انہیں عزت واحترام سے دعوت دی جاتی تھی۔ خاں صاحب کو عربی، فارسی اور اردو پر اچھا عبور حاصل تھا۔ ہندی وانگریزی سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔

اپنی تعلیمی قابلیت کا ذکر خاں صاحب نے اپنے ایک خط (بہ شکل استعفا) مرقومہ ۲۹/اکتوبر ۱۹۶۴ء بنام صدر اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول، شاہ جہاں پور میں بڑے بے باکانہ انداز میں کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

> ''جناب صدر! میں نے اسلامیہ اسکول سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا، بلکہ صحیح معنی میں اسی ماحول میں شعور کی آنکھیں کھلیں۔ اچھے ماحول کے اثر سے، اچھے ساتھیوں کی ہمت افزائی سے اور اسکول کی چھوٹی سی لائبریری کے فیض سے مطالعے کا شوق اور بڑھا۔ لائبریری کی اچھی کتابوں نے تنقید وتحقیق کی طرف متوجہ کیا اور آٹھ برس کی نسبتاً طویل مدت اس کی نشو ونما کے لیے بے حد سازگار ثابت ہوئی۔ لائبریری کی کتابوں نے، میرے بیشتر رفیقانِ کار کی ہمت افزائی نے اور اربابِ اختیار کی خاموش سرپرستی نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اعلیٰ تحقیقی کاموں میں حصہ لینے کا اہل سمجھا جاؤں۔
>
> میں نے جس وقت اسلامیہ اسکول میں ملازمت کے لیے درخواست دی تھی، اس وقت میرے پاس کسی یونیورسٹی، کسی کالج یا کسی اسکول کی کوئی ڈگری نہیں

تھی، اس کے باوجود آپ نے ازراہ التفات خاص مجھے منتخب فرمایا تھا۔ آج جب کہ میں ہندوستان کی ایک اعلاترین یونیورسٹی میں کام کررہا ہوں، آج بھی کسی ایسی سند سے تہی دست ہوں۔ یہ اہمیت اسی اسکول کی بخشی ہوئی ہے اور اس روایت کے موسس آپ ہیں"۔ ("رشید حسن خاں کے خطوط" جلد دوم، مرتب راقم الحروف، اشاعت نومبر ۲۰۱۵ء، ص ۳۸۰-۸۱)

گذشتہ اوراق میں اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ حالات کی مجبوری کی وجہ سے یہ درس نظامی کی تعلیم بھی مکمل نہیں کرپائے تھے۔ زندگی میں جو بھی علم انہوں نے حاصل کیا وہ سب کا سب اکتسابی ہے، خاں صاحب نے جو ادبی کارنامے انجام دیے، بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے بعض سند یافتہ پروفیسر حضرات ان کے عشر عشیر تک بھی نہیں پہنچ پائے۔

تحقیق، تنقید و تدوین سے متعلق خاں صاحب جین صاحب سے بہت پہلے مضامین لکھ چکے تھے۔ اصل میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہی تحقیقی و تنقیدی مضامین سے ہوا تھا۔ جن کی شہرت کی وجہ سے ہی خواجہ احمد فاروقی صاحب صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی نے انہیں اپنے ہاں لے آئے تھے۔ اپنی تحریروں سے متعلق ایک خوبصورت لطیفہ اپنے مکتوب مرقومہ ۲ مئی ۲۰۰۵ء بنام پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور) کے آخر میں شاہ جہاں پور سے یوں لکھتے ہیں:

"۱۹۵۲ء میں اسلامیہ اسکول میں ملازم ہو گیا تھا اردو پرشین ٹیچر کے طور پر۔ مولانا عرشی مرحوم سے پہلی بار ملاقات اسی کانفرنس میں ہوئی تھی۔ مجھے مولانا کا یہ جملہ آج تک یاد ہے کہ ارے بھائی! داڑھی کہاں رکھ آئے؟ وہ مجھے میری تحریروں سے عمر رسیدہ مولوی سمجھتے تھے، میں نکلا کچھ اور، وہ بھی کیا دن تھے"۔ (مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، اشاعت جون ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۶)

راقم رشید حسن خاں صاحب کے چند ایسے تحقیقی مضامین کا مختصر سا ذکر کرنا چاہتا ہے جن کی وجہ سے ادبی دنیا میں بحیثیت محقق انہیں بہت شہرت ملی۔ اردو کی ادبی تاریخ (پروفیسر عبدالقادر سروری)

ماہنامہ تحریک ستمبر ۱۹۵۹ء، علی گڑھ تاریخ ادب اردو، ماہنامہ تحریک نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۶۳ء، ثقافت پاکستان (شیخ محمد اکرام) ایضاً جولائی ۱۹۶۴، تحقیق سے متعلق بعض مسائل (قسط اول، دوم، سوم، چہارم، اپریل و جولائی ۱۹۶۷ء)، اکتوبر ۱۹۶۷ء، جنوری ۱۹۶۸ء، اپریل ۱۹۶۸ء، نوائے ادب بمبئی، تذکرۂ معاصرین (مالک رام) تحریک نئی دہلی، ستمبر ۱۹۷۲ء، دیوان غالب (صدی ایڈیشن مالک رام) ایضاً ۱۹۷۴ء، اور تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، جنوری ۱۹۷۷ء۔

ان تحقیقی تبصروں نے اردو دنیا میں ایک ہلچل سی مچادی، خاص کر علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے سلسلے میں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے علی گڑھ یونیورسٹی کی پیش کی ہوئی تاریخ ادب اردو کی اسکیم منظور کر کے ایک بڑی رقم اس پروجیکٹ کے لیے مختص کی تھی۔ اس اسکیم کے ڈائرکٹر پروفیسر آل احمد سرور اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر مجنوں گورکھپوری تھے۔ یہ کتاب ۵۵۴ صفحات پر محیط پہلی بار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی تھی۔

خاں صاحب نے اس تاریخ ادب اردو پر ایک طویل تحقیقی تبصرہ لکھا جو ماہنامہ تحریک نئی دہلی کے شمارہ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں پہلی بار ص ۲۱۱ تا ۲۲۳ پر شائع ہوا۔ یہاں سے یہ ملک کے دوسرے مقتدر رسائل میں شائع ہوا۔ ادبی دنیا میں ایک بڑا ادبی دھماکہ سا ہوا۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے ایک حکم کے مطابق مارکیٹ سے اس کے تمام نسخے واپس منگوا کر گودام میں ڈال دیے گئے۔ اور ایک کثیر رقم کا پروجیکٹ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ جس سے یونیورسٹی کو مالی نقصان ہی نہیں ہوا، ادبی نقصان بھی ہوا۔ تب سے آج تک اس موضوع پر دوبارہ کوئی اسکیم مرتب نہیں کی گئی اور نہ ہی ادبی تاریخ پر دوبارہ کوئی کام ہوا۔ اس ادبی تاریخ سے متعلق خاں صاحب کے خیالات ملاحظہ فرمائیں:

> ”برسوں کے انتظار کے بعد اس تاریخ کی پہلی جلد شائع ہوئی جس کو پڑھ کر سب سے پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ غالباً غلط نگاری کے کسی مقابلے میں حصہ لینے کے لیے اس کو مرتب کیا گیا ہے۔ کتاب کی تمہید میں کئی جگہ مغرب میں ادبی تاریخ نگاری کا ذکر کیا گیا ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کتاب بھی مغربی تاریخوں کے انداز و معیار کو

ملحوظ رکھ کر اسی طرز پر مرتب کی گئی ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا کہ وہاں اصل حیثیت ایڈیٹر کی ہوتی ہے۔ اس کی علمیت اور صلاحیت نظر ثانی و حسن ترتیب کے فرائض کو ادا کرتی ہے اور منتشر اجزا کی شیرازہ بندی کرتی ہے، جس سے یہ تاریخ معرا ہے۔ درحقیقت اس کو ایسے مضامین کا مجموعہ کہنا چاہیے جن میں نہ باہم ربط ہے، نہ تناسب و توافق۔ اس کے بجائے متضاد بیانات، غیر متعلق تفصیلات، غلط سنین اور غیر معتبر اقتباسات کی فراوانی ہے۔

ہمارے یہاں ناموں سے مرعوب کرنے کا اچھا خاصا رواج ہے۔ اس کا نتیجہ بعض وقت بے حد عبرت ناک ہوتا ہے۔ کچھ مشہور افراد کے نام لکھ کر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ترتیب و تدوین کے سارے تقاضے بھی پورے ہو گئے اور ہر قسم کی بے احتیاطیوں کے جواز کا منشور بھی ہاتھ آ گیا، یہ کتاب اس کی سب سے اچھی مثال ہے۔ دو معروف نقاد پروفیسر آل احمد سرور اور جناب مجنوں گورکھپوری بالترتیب اس کے ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں۔ تنقید میں دونوں حضرات کا مرتبہ مسلم سہی، لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ پہلی جلد سراسر تاریخی و تحقیقی خشک بیانیوں کا مجموعہ ہے۔ تحقیق میں نہ پسی ہوئی بجلیاں ہوتی ہیں نہ دھلی دھلائی چاندنی۔ نہ اس میں اتنی لچک ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہو یا بیدل کی شاعری کا، ہر موضوع کو کسی فرضی صاحبزادی کو سمجھایا جا سکے، یہ نہایت خشک، نسبتاً غیر دلچسپ اور اس سے بھی زیادہ صبر آزما کاروبار ہے۔ آدمی اسی کا ہو رہے، تب کچھ کر سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب گناہ گار کا نامۂ اعمال بن گئی۔ اس میں اتنی غلطیاں ہیں کہ آب حیات کی غلطیوں کو شمار کرنا اس کے ساتھ بھی ناانصافی ہے اور اس کتاب کے ساتھ بھی''۔ (ماہنامہ تحریک، نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۶۳ء، ص ۲۱۱-۲۲۳، مشمولہ ''مقالات رشید حسن خاں'' مرتبہ راقم الحروف، جلد دوم، غیر مطبوعہ، ص ۲۷۷-۲۷۸)

تحقیق کی اصل تعریف خاں صاحب کے نزدیک اس ڈیڑھ سطر میں پوشیدہ ہے:

''یہ نہایت خشک، نسبتاً غیر دلچسپ اور اس سے بھی زیادہ صبر آزما کاروبار ہے۔ آدمی اسی کا ہو رہے، تب کچھ کر سکتا ہے''۔

تحقیق سے متعلق جین صاحب کے خیالات کو درج کرنے سے قبل راقم خاں صاحب کے بتائے ہوئے چند اصولوں کو درج کرنا مناسب سمجھتا ہے:

''حقائق کی بازیافت تحقیق کا مقصد ہے۔ اس کو یوں بھی کہا گیا ہے کہ ''تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے'' (قاضی عبدالودود) اس کے لیے یہ ماننا ہوگا کہ حقیقت واقعہ (یا اصلی شکل) بذات خود موجود ہوتی ہے، خواہ معلوم نہ ہو۔ اس بنا پر یہ بات بھی ماننا ہوگی کہ ایسی رائیں جو تاویل اور تعبیر پر مبنی ہوں، واقعات کی مرادف نہیں ہو سکتیں............

............ادبی تحقیق میں کسی امر کا وجود بطور واقعہ اسی صورت میں متعین ہوگا جب اصول تحقیق کے مطابق اس کے متعلق معلومات حاصل ہو۔

واقعے کا چھوٹا یا بڑا ہونا یا اہم اور غیر اہم ہونا ادبی تحقیق میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ صفاتی الفاظ صرف اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں اس واقعے سے کام لیا جا رہا ہے''۔ (ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، یوپی اردو اکادمی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱)

تحقیق میں کن مآخذ سے کام لینا چاہیے:

''جن مآخذ سے کام لیا جائے، وہ قابل اعتماد ہوں، غیر متعین، مشکوک اور قیاس پر مبنی خیالات کا مصرف جو بھی ہو، ان کی بنیاد پر تحقیق کے نقطۂ نظر سے قابل قبول نتائج نہیں نکالے جا سکتے''۔ (ایضاً، ص ۱۲)

(جاری)

جرجی زیدان کی تصانیف کا مختصر تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر محمد شاکر رضا

جرجی زیدان (۱۹۱۴-۱۸۶۱ء) کو ایک مشہور ادیب، ناول نگار، مؤرخ اور بطور صحافی کے جانا جاتا ہے، ان کی پیدائش بیروت کے ایک غریب عیسائی گھرانے میں ہوئی، ان کے والد پڑھے لکھے نہ تھے، وہ ایک چھوٹا سا ہوٹل چلاتے تھے جو بیروت کے امریکی کالج کے طلبہ کے لیے ایک اڈہ تھا، اسکولی تعلیم کے بعد جرجی زیدان کو اپنی پڑھائی منقطع کرنی پڑی، اب وہ اپنے والد کے ساتھ ہوٹل میں کام کرنے لگے، لیکن ان کو کتابوں، مجلّات اور اخبار سے بے انتہا شغف تھا اور وہ کام کے دوران بھی اپنا مطالعہ جاری رکھتے، امریکی کالج کے اکثر طلبہ، فارغین اور ادبا ان کو پہچانتے تھے، جن کے واسطے وہ کالج کے مختلف علمی وادبی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے، ان مجلسوں سے وہ کبیدہ خاطر یہ حسرت لے کر نکلتے کہ کاش ان کو بھی لوگوں کے سامنے بولنے کا موقع ملتا اور لوگ ان کی بات بھی غور سے سنتے، آخر کار اس نے کام چھوڑ کر کالج میں پڑھنے کا عزم کیا اور ۱۸۸۱ء میں بیروت کے امریکی کالج میں داخلہ لیا جہاں اس نے طب کی پڑھائی کی، ۱۸۸۳ء میں اس نے مصر کا سفر کیا اور طب کو چھوڑ کر صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور مصر کے اخبار الزمان کے لیے کام کرنے لگا، اسی درمیان وہ مصر کی برطانوی انٹیلی جینس سے بھی جڑ گیا جہاں اس نے ترجمان کے فرائض ادا کیے۔ ۱۸۸۵ء میں عبرانی اور سریانی زبان سیکھنے کے لیے اس نے بیروت کا سفر کیا، ۱۸۸۶ء میں اس نے لندن کا سفر کیا اور وہاں کے نامور مستشرقین سے استفادہ کیا۔ اسی سال جرجی زیدان قاہرہ لوٹ گیا اور مشہور جریدہ المقتطف کا ملازم ہوگیا، ۱۸۸۹ء میں المقتطف کو چھوڑ کر وہ مستقل تصنیف وتالیف کی طرف متوجہ ہوا، ۱۸۹۲ء میں

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، موبائل: ۹۷۰۴۹۶۷۶۹۴۔

اس نے الہلال کے نام سے ایک عربی جریدے کا آغاز کیا جس میں بڑے بڑے ادیبوں نے قلمی طور پر حصہ لیا، خود جرجی زیدان نے اپنے علمی کاموں کو سب سے پہلے الہلال میں قسط وار شائع کیا، الہلال اپنے وقت کا بے حد مقبول رسالہ ثابت ہوا، جرجی زیدان کا ۱۹۱۴ء میں قاہرہ میں اچانک انتقال ہوگیا، اس کی وفات پر احمد شوقی، حافظ ابراہیم، خلیل مطران اور ایلیا ابوماضی جیسے عربی کے نامور شعرا نے مرثیے کہے، امیر الشعرا احمد شوقی نے کہا:

هِضابُ لُبنان مِن مَنعاتكَ اضطرَبَت كأَن لبنانَ مَرْمِيٌّ بزلزال

كذلك الأرضُ تبكى فَقْدَ عالِمِها كالأم تبكى ذهابَ النافعِ الغالى (۱)

ترجمہ: لبنان کی سرزمین تیری (موت) کی سختی سے دہل گئی، ایسا لگا جیسے لبنان میں زلزلہ آ گیا ہو، ہر زمین اپنے عالم کی موت پر ایسے آنسو بہاتی ہے جیسے ماں اپنے نفع بخش اور گراں قدر (بیٹے) کی موت پر آنسو بہاتی ہے۔

یہ حیرت انگیز امر ہے کہ جرجی زیدان کا ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوگیا، مگر اس کا جاری کردہ جریدہ الہلال ۱۲۸ سال گزرنے کے باوجود اب بھی جاری ہے، مصر کے مشہور ادیب و محقق احمد زکی پاشا کا جریدہ الہلال کے بارے میں کہنا ہے کہ: آسمان کا چاند گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، لیکن جرجی زیدان کا ہلال (چاند) ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔

جرجی زیدان کا شمار مصر کے نامور مؤرخین میں ہوتا ہے، بڑے بڑے ادیبوں اور قلم کاروں نے جرجی زیدان کی علمی ادبی اور تاریخی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان میں بطور خاص محمد حسین ہیکل، طٰہٰ حسین، عباس محمود عقاد، مصطفی لطفی منفلوطی، سلامہ موسی، یعقوب صروف، لویس عوض، محمود عزمی، حسین فوزی وغیرہم کے نام شامل ہیں، (۲) جرجی زیدان کو عربی، انگلش، فرانسیسی، جرمنی اور لاطینی زبانوں پر مہارت تھی، اس کے علاوہ اسے عبرانی، سریانی، اطالوی اور ہسپانوی زبانیں بھی آتی تھیں، ان زبانوں پر قدرت کی وجہ سے جرجی زیدان کے افکار اور مطالعہ کی دنیا بے حد وسیع تھی۔ اس نے مختلف موضوعات: تاریخ، جغرافیہ، ادب، لسانیات اور ناول نگاری پر منفرد انداز میں متعدد کتابیں لکھیں، بعض کے نام یوں ہیں: العرب قبل الاسلام، تاریخ التمدن الاسلامی، تاریخ مصر الحدیث، تراجم مشاہیر الشرق، فلسفۃ اللغۃ العربیۃ، تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ۔ جرجی زیدان کی کتابوں کو جس قدر تنقید کا سامنا کرنا پڑا، بیسویں صدی کے ربع اول میں کسی ادیب یا اسکالر کی کتاب کو ایسی تنقید کا

سامنا نہیں کرنا پڑا، جرجی زیدان نے ان تنقیدوں کی پروا نہیں کی اور ادب و تاریخ اسلام پر نئی نئی کتابیں تحریر کرتا رہا۔ اس کی تصنیفات کا ترجمہ متعدد زبانوں میں کیا گیا ہے۔ اس نے قلیل مدت میں جو کام انجام دیا ہے اس کی بنیاد پر اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی بعض اہم اور مشہور تصنیفات کا ہم یہاں جائزہ لیتے ہیں۔

اپنے وسیع مطالعے کی روشنی میں جرجی زیدان نے ''تاریخ التمدن الاسلامی'' کے نام سے اسلامی تمدن پر پانچ حصوں پر مشتمل کتاب کی تصنیف کی جسے اسلامی دنیا میں بڑی شہرت اور پذیرائی ملی، لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور تاریخ اسلامی کے باب میں اسے ایک اضافہ تصور کیا۔ یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کی اشاعت ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۶ء کے درمیان ہوئی، پہلے حصے میں اسلام سے قبل عربوں کی حالت، دور جاہلی میں عربوں کی حکومت، آغاز اسلام تک کعبہ و قریش کی حالت، ظہور اسلام اور اس کی اشاعت، اسلامی فتوحات، اموی، عباسی، اندلسی اور فاطمی حکومتوں کا قیام، اسلامی سلطنت کا عروج و کمال اور سلطنت کے مختلف شعبوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں اسلامی سلطنت کی دولت مندی اور رعایا کی خوشحالی کا ذکر کیا گیا ہے، اس حصے میں خلفا کی مجالس، ان کے مشاغل، ان کی علم دوستی، شعر و ادب سے ان کی دلچسپی کے علاوہ اسلامی عمارتوں اور شہروں وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں شعر و ادب، عربی و اسلامی علوم و فنون، اسلامی مدارس اور کتب خانوں کو بیان کیا گیا ہے، اس میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اسلام سے پہلے شام و عراق میں شعر و ادب کی کیا حالت تھی اور مسلمانوں نے اس میں کیا ترقی کی۔ چوتھے حصے میں اسلامی مملکتوں کا نظام، خلفائے راشدین، اموی، عباسی، اندلسی اور فاطمی سلطنتوں کے خلفا کے احوال، ان کا طرز حکمرانی اور عوام کے ساتھ ان کے سلوک کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کے پانچویں اور آخری حصے میں معاشرتی نظام، لوگوں کے مختلف طبقات، سماجی رسم و رواج اور اسلامی مملکتوں، شہروں کی تہذیب و تمدن اور حکمرانوں کے آثار اور کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصے کے مقدمہ میں جرجی زیدان نے بیان کیا ہے کہ اس نے اس کتاب کی تالیف کے لیے دو سو سے زیادہ کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ (۳)

اس کتاب کی تصنیف روایتی انداز سے ہٹ کر جدید طرز پر ہوئی ہے لیکن مصنف نے نہ صرف مستشرقین کی کتابوں سے بلکہ ان کے اسلوب سے بھی استفادہ کیا ہے، اسی لیے وہ جا بجا اسلامی تمدن کو

مستشرقین کی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جرجی زیدان نے مستشرقین سے استفادہ ضرور کیا لیکن اس نے اس موضوع پر ایسے اضافے بھی کیے جن کی طرف ان مستشرقین کی نظر اب تک نہیں گئی تھی۔ کتاب ''تاریخ التمدن الاسلامی'' کی اہمیت کے پیش نظر اس کی اشاعت کے فوراً بعد متعدد اسکالرس اور اصحاب قلم نے عربی، اردو اور دوسری زبانوں میں اس پر تقریظات لکھے اور کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا۔ اس کتاب کا پہلا حصہ شائع ہونے کے بعد علامہ شبلی نعمانی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جرجی زیدان کو ایک خط ارسال کیا تھا جس میں انہوں نے اس اہم موضوع سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے عالم اسلامی میں کتاب کی مقبولیت کا ذکر کیا، ساتھ ہی مصنف پر اس امر پر تنقید بھی کی کہ وہ مصادر و مراجع کا ذکر صرف اجمالی طور پر کتاب کے مقدمہ میں کر دیتے ہیں، اور محل استنباط و استشہاد میں مراجع و مصادر کا ذکر نہیں کرتے ہیں جس کی وجہ سے قاری کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اگر مصادر و مراجع کے ذکر کا التزام کیا جائے تو بوقت ضرورت ان کی طرف رجوع کرنا آسان ہوگا۔ مصنف کتاب نے اس خط کو کتاب کے دوسرے حصے میں نقل کیا ہے اور دوسرے ایڈیشن میں علامہ کے اس مشورے پر عمل کیا ہے۔ مکمل کتاب کے شائع ہونے کے بعد علامہ نے اس کتاب کی تنقید میں ''الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی'' کے نام سے ایک مبسوط مقالہ لکھا جو اس وقت مصر کے مشہور جریدہ ''المنار'' میں ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا، ان کا یہ مقالہ رسالہ کی شکل میں ۸۲ صفحات میں ۱۹۱۲ء میں آسی پریس لکھنؤ سے بھی شائع ہوا اور بعد میں علامہ نے اس مقالے کی تلخیص اردو میں کی جو ماہنامہ الندوہ کے شعبان ۱۳۲۸ھ کے شمارے میں شائع ہوا، اس مقالے میں انہوں نے علمی انداز میں دلائل کے ساتھ جرجی زیدان کی پھیلائی ہوئی بہت سی غلط فہمیوں کا جواب دیا ہے، علامہ کا یہ رسالہ بھی علمی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ انہوں نے لکھا کہ جرجی زیدان ایک عیسائی مصنف ہے جس نے در پردہ مسلمانوں پر نہایت سخت اور متعصبانہ حملے کیے ہیں لیکن بظاہر مسلمانوں کی مدح سرائی کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر اس کی فریب کاریوں پر نہیں پڑی اور کتاب گھر گھر پھیل گئی۔ اس کتاب کی تالیف کے اہم مقاصد یہ ہیں: عرب کی تحقیر اور ان کی مذمت، اس بات کا اثبات کہ خلفائے بنی امیہ و عباسیہ مذہب کی توہین کرتے تھے، یہاں تک کہ منصور نے بغداد میں کعبہ کی تحقیر کے لیے قبہ خضراء بنوایا اور معتصم نے سامرہ میں کعبہ اور صفا و مروہ تعمیر کیا، مسلمانوں پر عام

اعتراضات، ان مقاصد کے لیے مصنف نے کذب ودروغ، روایات کی نقل میں خیانت وتحریف، غلط استنباط واستدلال کے ذریعے کام لیا ہے۔(۴)

یہ کتاب اس حیثیت سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں بے حد اہم موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے، کسی قوم کی اصلی تاریخ اس کے تمدن اور آبادکاری کی تاریخ ہوا کرتی ہے، نہ کہ اس کے جنگی کارناموں اور فتوحات کی اور اس امر کی طرف عام طور پر عرب مؤرخین نہیں گئے ہیں، لیکن قاری کو اس کتاب کا مطالعہ یہ سوچ کر کرنا چاہیے کہ یہ ایک عیسائی اسکالر کی تصنیف ہے اور ہمیں عیسائی اسکالر سے وہ توقع نہیں کرنی چاہیے جس کی ہم مسلم مصنّفین اور اسکالرس سے کرتے ہیں۔

جرجی زیدان کی یہ کتاب شائع ہوتے ہی عالم عربی واسلامی میں قلیل عرصے میں بے حد مقبول ومشہور ہوئی، اور انگریزی، فرانسیسی کے علاوہ اردو، فارسی اور ترکی زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گیے۔ مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ردولوی نے اس کتاب کے دو حصوں کا ترجمہ اردو زبان میں ''تاریخ تمدن اسلام'' کے نام سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ پہلی بار مطبع روز بازار امرتسر سے شائع ہوا تھا، ترجمے میں تاریخ اشاعت درج نہیں ہے لیکن ان کے ترجمہ شدہ ناولوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ ترجمہ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں کیا ہوگا، یہ ترجمہ کافی عرصے سے نایاب تھا، لہٰذا فرید بک ڈپو دہلی نے ۲۰۰۷ء میں اسے شائع کیا۔ ترجمہ عمدہ ہے، پہلے ایڈیشن میں ترجمہ میں بعض جگہوں پر جو سخت زبان استعمال کی گئی تھی اسے اس ایڈیشن میں آسان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جرجی زیدان کی شہرت کی اصل وجہ اس کے اسلامی تاریخی ناول ہیں، رومانوی اور جذباتی انداز میں اسے اسلامی تاریخی ناول نگاری کا علمبردار کہا جاتا ہے، اس نے اسلامی تاریخ کے حوالے سے سلسلہ وار ۲۳ تاریخی ناول لکھے جن میں سے سترہ ناولوں کا تعلق عربی واسلامی تاریخ سے ہے، ان میں قبل اسلام، آغاز اسلام، اموی وعباسی سلطنت سے لے کر صلاح الدین ایوبی کے زمانے تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ چار ناولوں میں جدید مصری تاریخ کو بیان کیا گیا ہے، ایک ناول میں عثمانی سلطنت کے نشیب وفراز کی سرگزشت ہے، جب کہ ایک ناول جہاد المحبین، تاریخی نہیں بلکہ سماجی ہے جس میں مصر میں انیسویں صدی کے سماجی حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان ناولوں میں جرجی زیدان نے یوروپ کے تاریخی ناول نگار والٹر اسکاٹ (۱۷۷۱-۱۸۳۲ء) اور الیگزینڈر ڈوما (۱۸۰۲-۱۸۷۰ء) سے متأثر ہوکر

ان کے نقل کی کوشش کی ہے، فنی اعتبار سے وہ اگرچہ ان مشہور ناول نگاروں کے رتبے کو نہیں پہنچ سکا مگر ادبیات عربی کے حوالے سے بہت حد تک کامیاب رہا، ان ناولوں میں جرجی زیدان ماضی میں عربوں کی سیاسی زندگی کو بدلنے میں جو حوادث وواقعات پیش آئے انہیں بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرتا ہے، ناولوں کے عناوین یوں ہیں: فتاة غسان، أرمانوسة المصرية، عذراء قريش، ۱۷/ رمضان، غادة كربلا، الحجاج بن يوسف، فتح الأندلس، شارل وعبد الرحمن، أبو مسلم الخراساني، العباسة أخت الرشيد، الأمين والمأمون، عروس فرغانة، أحمد بن طولون، عبد الرحمن الناصر، فتاة القيروان، صلاح الدين الأيوبي، شجرة الدر، الانقلاب العثماني، أسير المتمهدي، المملوك الشارد، استبداد المماليك، محمد علي، جهاد المحبين۔

ان ناولوں میں اسلامی تاریخ کو نہایت آسان اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے لوگ دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور ان کو کوئی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی، ان ناولوں کا مقصد محض ناول نگاری نہیں ہے بلکہ تاریخ کو بیان کرنا ہے، یہی وجہ ہے کہ جرجی زیدان ان ناولوں کے شروع میں مصادر ومراجع کا بھی ذکر کرتا ہے لیکن چوں کہ محض تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں پر گراں گزرتا ہے، لہٰذا تاریخ کو رومانوی انداز میں ڈھالنا پڑا، لوگوں کو تاریخ سے واقف کرانے کا یہ بے حد دلچسپ اسلوب ہے۔ ان ناولوں میں عامیانہ زبان سے گریز کرتے ہوئے بے حد آسان اور سلیس زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان ہی اوصاف کی بنیاد پر جرجی زیدان کے یہ ناول مقبول ہوئے اور مصنف کی وفات کے بعد بھی ان کی بار بار اشاعت ہوئی۔

جرجی زیدان کے یہ ناول اس قدر مشہور ہوئے کہ یوروپی زبانوں کے علاوہ اردو، فارسی، ترکی، آذربائیجانی اور دوسری زبانوں میں بھی اس کے ترجمے کیے گئے، مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ردولوی نے فتاة غسان، أرمانوسة المصرية اور فتح الأندلس کو اردو زبان میں منتقل کیا ہے، ”فتاة غسان“ سلسلہ تاریخ اسلام کی پہلی کڑی ہے، یہ ایک زبردست حیرتناک اور نہایت دلآویز تاریخی ناول ہے جس میں اسلام کے حالات ابتدائے ظہور سے لے کر فتوحات عراق وشام تک بڑی خوش اسلوبی سے قصہ کے پیرائے میں دکھائے گئے ہیں۔ مصنف نے اس کے بیان کرنے میں بدرجہ کمال زورِ قلم دکھایا ہے۔ ”ارمانوسہ“ سلسلہ تاریخ اسلام کی دوسری کڑی ہے جس میں حضرت عمرو بن عاصؓ کے ہاتھوں مصر کی

فتوحات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ ناول بھی نہایت دلچسپ اور حیرت ناک ہے جس میں حسن و عشق کے فرضی افسانے نہیں بلکہ سچے واقعات اور اسلامی عظمت و جبروت کے عدیم المثال کارنامے خوبی سے بیان کیے گیے ہیں۔ فتح الاندلس کا ترجمہ مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ردولوی نے ''فتح اندلس'' کے نام سے کیا ہے جو ۱۳۲۳ ہجری (بمطابق ۱۹۰۵ء) میں مطبع روز بازار امرتسر سے شائع ہوا، ''فتح اندلس'' میں اسلامی فتوحات، اسپین کے مناظر، مجاہدین کی پرہیزگاری، سپہ سالاران اسلام کے زریں کارنامے، مسلمان حاکموں کی انصاف پروری، عیسائی فرمانرواؤں کی بداخلاقی، یہودیوں کی مظلومی اور انتقام کشی کے نقشے کھینچے گئے ہیں، مترجم کا یہ ترجمہ بامحاورہ، نہایت آسان اور دلچسپ ہے۔

مولانا مولوی آغا رفیق صاحب بلند شہری نے اردو میں جرجی زیدان کے تین ناولوں کا ترجمہ کیا ہے، مولانا کا شمار بیسویں صدی کے مشہور ادبا و مترجمین میں ہوتا ہے، انہوں نے عربی کے علاوہ انگریزی کے متعدد ناولوں کا بھی ترجمہ کیا ہے، انہوں نے جرجی زیدان کے ناول الحجاج بن یوسف کا ترجمہ اردو میں کیا جو پہلی بار ۱۹۱۹ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے چھپا۔ اس تاریخی ناول میں خلافتِ اسلامی کے نازک ترین زمانہ کی تاریخ بیان کی گئی ہے، جس میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، محمد بن حنفیہ اور بنوامیہ کے ان مناقشوں اور لڑائیوں کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں جو خلافت کے استحقاق کے مسئلے پر ہوئے، قاتلان امام حسینؓ سے انتقام کا لیا جانا، مکہ معظّمہ کا محاصرہ، حجاج کی حرم محترم پر سنگباری، عبداللہ بن زبیرؓ کا قتل اور عبدالملک کا بلاشرکت غیر خلافت پر استقلال، حسن عراقی اور سمیہ کی سچی محبت کی داستان اور دیگر واقعات پُراثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا نے جرجی زیدان کے دو اور ناول شارل وعبدالرحمٰن اور أسیر المتمھدی کے بھی ترجمے کیے ہیں، اور دونوں ترجموں کو نول کشور پریس لکھنؤ سے ۱۹۱۸ء میں شائع کیا، ''شارل وعبدالرحمٰن'' میں سرزمین فرانس پر عربوں کا حملہ، امیر عبدالرحمٰن والی اندلس اور شارل (چارلس) مارٹل حاکم فرانس کی پُرجوش سپاہ کا مقابلہ، جنگ کے خونریز مناظر، فتوحات، ناکامی اور واپسی کے تاریخی واقعات، اسلامی تاریخ کے بعض سربستہ اسرار کا انکشاف، اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مسیحی بزرگان مذہب کی رائے، اسلامی سپاہ کے افسر اعلیٰ ہانی و مریم کے عشق و محبت کی پُردرد داستان اور دلگداز انجام بڑے دلچسپ طریقہ پر بیان کیے گئے ہیں، جب کہ ناول أسیر المتمھدی کا ترجمہ ''انقلاب سیاسی'' سے کیا ہے، ناول میں انیسویں صدی کے آخر میں مصر و سوڈان

کے سیاسی حالات، سوڈان میں مہدی سوڈانی اور انگریزوں کی معرکہ آرائیاں، خرطوم پر انگریزوں کا قبضہ، شفیق آفندی اور زبیدہ کی پاک محبت کے دلچسپ واقعات، ہجر و وصال، حسن و عشق کے کرشمے، عزیز نامی ایک دوست کا رقابت و حسد سے بغلی گھونسہ مارنا، شفیق آفندی کا ترحم آمیز نیک برتاؤ، ایک بال دار کھوپڑی کا مقفل صندوق میں رہنے کا راز اور دوسرے واقعات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ ترجمے نہایت آسان زبان میں کیے گیے ہیں، ان ترجموں میں مترجم نے نفس ترجمہ کو ملحوظ نہیں رکھا ہے بلکہ طوالت سے بچنے کے لیے بہت سی غیر ضروری باتوں کو نظر انداز کر کے اصل واقعات کو مدنظر رکھا ہے۔

مقبولیت کے ساتھ ساتھ جرجی زیدان کے ناولوں کو بھی سخت اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا، جیسے: چوں کہ جرجی زیدان مسیحی ہے، اس لیے وہ تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے، مختلف مقامات پر تعصب سے کام لیتا ہے اور مستشرقین اور مغربی مصنّفین کی کتابوں سے بھی استشہاد کرتا ہے۔ وہ تاریخ اسلامی کے روشن اور سنہرے دور کو مغربی مؤرخین کی نظر سے دیکھتا ہے، تاریخ اسلامی میں جہاں کہیں سنہرے دور کی بات آتی ہے تو وہ اس کی صحیح تصویر کشی نہیں کرتا بلکہ انہیں سیاسی اور مذہبی اختلافات کے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ اسلامی شخصیتوں (صلاح الدین ایوبی، ہارون رشید، سلطان عبدالحمید، عبدالرحمٰن ناصر، احمد بن طولون، امین و مامون، عبدالرحمٰن داخل وغیرہم) کی غلط تصویر کشی کرتا ہے، ان کی فتوحات کو ظلم و زیادتی اور سلب اموال سے تعبیر کرتا ہے اور ان شخصیتوں کو مشکوک اور متہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام کے روشن اور اہم واقعات کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی جزئی امر یا واقعہ سے حکم کلی یا عام اصول کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عیسائی راہبوں کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ اور امن و سلامتی کے پیغامبر کے طور پر کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں جو آپسی تنازعات پیش آئے وہ جرجی زیدان کے لیے زرخیز زمین کی حیثیت رکھتے ہیں، ان اختلافات و واقعات پر خصوصی روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کرداروں کی عیب جوئی کرتا ہے۔(۵)

ان ناولوں کی افادیت اس اعتبار سے ہے کہ وہ لوگ جو تاریخ کے خشک مضمون سے دلچسپی نہیں رکھتے وہ ان ناولوں کے مطالعہ سے تاریخ اسلام کے اہم واقعات سے واقف ہوتے ہیں اور اپنی قومی و مذہبی زندگی کے تغیرات اور اسلامی حکومتوں کے عروج و زوال سے کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں، اسی کے پیش نظر مذکورہ اعتراضات کے باوجود ادب عربی میں جرجی زیدان کو تاریخی ناول کا بانی اور مؤسس مانا

جا تا ہے، کیوں کہ اس نے پہلی بار تعلیم ،تفریح اور تاریخ کو یکجا کر کے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

جرجی زیدان نے یوروپی اصولوں کو مد نظر رکھ کر کارل بروکلمان کے طرز پر ''تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ'' کے نام سے ادبیات عربی کی تاریخ لکھی ، یہ کتاب چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد میں تین سو ساٹھ صفحات ہیں جن میں دور جاہلی ، آغاز اسلام اور اموی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کا آغاز تمہیدی مقدمے سے ہوتا ہے جس میں زبان کے آداب، مصادر ادب، یونانی ادب اور اسلام سے قبل عربوں کے آداب کا تذکرہ ہے، جاہلی دور کے ادب پر گفتگو کرتے ہوئے جاہلی شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، آغاز اسلام کے دور میں عربوں کے آداب، شاعری اور خطابت میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں، شاعری کے حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا کیا موقف تھا، علوم وفنون میں کیا ترقی ہوئی ، ان سب چیزوں پر گفتگو کی گئی ہے، اموی دور میں اس زمانے کی خصوصیات ، ادب میں ان کے اثرات ، خطابت اور انشا پردازی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کی دوسری جلد چار سو صفحات پر مشتمل ہے جس میں عصر عباسی کے آغاز یعنی ۱۳۲ ہجری سے اس کے اختتام یعنی ۶۵۶ ہجری کے ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے، عصر عباسی کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر دور کی سیاسی اور سماجی خصوصیتوں کو بیان کرتے ہوئے ان ادوار کے علوم وفنون پر گفتگو کی گئی ہے۔ تیسری جلد بھی چار سو صفحات پر مشتمل ہے مگر یہ باقی جلدوں سے اس اعتبار سے الگ ہے کہ اس میں بے شمار علمی وادبی کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے، اس جلد میں مصنف نے عباسیوں کے چوتھے دور کے علوم وفنون کے علاوہ مغولی اور عثمانی دور کے علوم وفنون پر بھی تفصیل سے گفتگو کی ہے، چوتھی اور آخری جلد بھی چار سو صفحات پر مشتمل ہے ، یہ جلد اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں انیسویں صدی کے عربی ادب کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے، ''تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ'' کو مشہور مؤرخ شوقی ضیف نے حواشی میں مفید تعلیقات اور بہت سارے اضافوں کے ساتھ قاہرہ سے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا ہے۔

''تاریخ آداب اللغة العربية'' کو علمی حلقوں میں ادبیات عربی کے حوالے سے بڑی پذیرائی ملی، جرجی زیدان سے قبل بھی لوگوں نے عربی ادب کی تاریخ پر کتابیں لکھی تھیں لیکن جو اسلوب اور منہج اس کتاب میں جرجی زیدان نے اختیار کیا وہ ادب عربی کی تاریخ نویسی میں موجود نہیں تھا، اس منہج کو بعد کے تاریخ ادب عربی کے مصنّفین کی ایک بڑی تعداد مثلاً: مصطفیٰ صادق رافعی، احمد حسن

زیات، حنا فاخوری اور شوقی ضیف وغیرہ نے اپنی کتابوں میں اپنایا۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب ادبیات عربی کے میدان میں معلومات کا ایک خزانہ ہے کیوں کہ مصنف نے اس کتاب کے ذریعے عربی زبان و ادب کے شہروں، زمانوں، شخصیتوں، امتیازی خصوصیتوں اور اسلامی تہذیب وثقافت کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے اور عربی زبان و ادب کے شائقین اور اسکالروں کو نئی دنیا سے متعارف کیا ہے۔ البتہ جرجی زیدان کی اس کتاب کے علاوہ دوسری کتابوں میں بھی یہ عادت ہے کہ بہت ساری باتیں جن کا موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یا بالکل معمولی تعلق ہوتا ہے وہ اسے بہت ہی شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتا ہے اور بہت سارے مباحث، شخصیات یا واقعات ایسے ہوتے ہیں جن پر کما حقہ گفتگو کی ضرورت ہوتی ہے مگر جرجی زیدان ایسے مواقع پر یا تو بے حد اختصار سے کام لیتا ہے یا ان سے بالکل صرف نظر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جرجی زیدان نے ''تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ'' میں دس صفحات یونانی آداب واقسام، فلاسفہ یونان کی سوانح، فارسی زبان کے آداب واقسام، سریانی زبان کے آداب و اقسام اور آداب ہندی وغیرہ پر سیاہ کردیے ہیں (۶) جن کا آداب عربی سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ ساری معلومات اس نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے نقل کی ہیں جن کا ذکر غیر مناسب ہے بلکہ مناسب یہ تھا کہ دور عباسی کے علم کلام اور علم بلاغت کی نابغہ روزگار شخصیتوں کا ذکر کیا جاتا۔ اسی طرح جرجی زیدان نے قرآن وحدیث کی ادبی حیثیت پر بالکل روشنی نہیں ڈالی ہے جب کہ قرآن وحدیث کو ادب کا مصدر ومنبع مانا جاتا ہے۔

جرجی زیدان ادیب وصحافی ہونے کے علاوہ ماہر لسانیات بھی تھا، اس نے عربی زبان کے فلسفے کے موضوع پر ''فلسفۃ اللغۃ العربیۃ'' کے نام سے ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی جو پہلی بار ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب جرجی زیدان کی پہلی تصنیف ہے جسے اس نے پچیس سال کی عمر میں تصنیف کیا تھا۔ یہ کتاب پانچ مباحث پر منقسم ہے جس میں عربی زبان کی نشوونما، قدیم عرب کے نطق، مفردات کا زبان کی شکل اختیار کرنا اور اصوات، الفاظ ومعانی کے درمیان تعلقات پر نئی نئی بحثیں ہیں۔ اس میں مصنف نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عربی زبان بھی دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح دیگر زبانوں سے خلط ملط ہو کر بنی ہے، خالص عربی الفاظ کے متعلق بھی یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ لفظ فلاں زبان سے لیا گیا ہے اور یہ لفظ فلاں زبان سے، مصنف نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ

عربی میں الفاظ کی کمی ہے، گرچہ یہ کتاب جرجی زیدان کی پہلی تصنیف ہے مگر اپنے خوبصورت اسلوب اور مواد کی وجہ اس نے اسکالرس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی اور اس پر عرب وعجم کے متعدد علما نے نقدو تقریظ لکھے، عربی زبان میں یعقوب صروف (۱۸۵۲-۱۹۲۷ء) نے اس پر بہترین نقد لکھا جو مصر کے مشہور جریدہ المقتطف میں ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا، ہندوستان میں علامہ سید سلیمان اشرف بہاری (۱۸۷۸-۱۹۳۹ء) سابق صدر شعبہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بھی اپنی مشہور کتاب ''المبین'' میں عربی زبان کی اہمیت، افادیت اور دوسری زبانوں پر اس کی فوقیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جرجی زیدان کی کتاب پر نقد کرتے ہوئے اس کے تمام اعتراضات کا مدلل ومفصل جواب دیا ہے۔

جرجی زیدان کی کتاب تراجم مشاہیر الشرق کو سوانح وتراجم کے باب میں اسکالرس اور طلبہ کے لیے اہم مرجع مانا جاتا ہے، اس کتاب میں انیسویں صدی کے مشرق ومغرب کی مشہور شخصیتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان میں امرا، ملوک اور سیاسی شخصیات، شعرا، ادبا، مصلحین، مجددین اور اصحاب شعرو ادب کے علاوہ دوسرے میدان کے لوگوں کو بھی شامل کیا گیا ہے، ان شخصیتوں کی حیات وخدمات کو جرجی زیدان نے سب سے پہلے اپنے جریدے الہلال میں شائع کیا، پھر لوگوں کی طلب پر اسے کتاب کی شکل میں ۱۹۰۲ء میں شائع کیا، قارئین کے درمیان یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی۔

حواشی

(۱) احمد شوقی، دیوان الشوقیات، باب ثالث، ص ۷۳۳، مؤسسة هنداوی للتعليم والثقافة مصر، ۲۰۱۲ء۔
(۲) جرجی زیدان کی تفصیلی سوانح حیات کے لیے دیکھیں: جرجی زیدان، بقلم محمد عبدالغنی حسن، الهيئة المصرية العامة للتأليف والنشر، ط-۱۹۷۰ء۔ (۴) جرجی زیدان، تاریخ التمدن الاسلامی، الجزء الأول، ص ۹، مؤسسة هنداوی للتعليم والثقافة مصر، ۲۰۱۲ء۔ (۵) الشیخ شبلی النعمانی الهندی، الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی، ص ۲، ۳، مطبعة آسی بریس لکنؤ، ۱۹۱۲ء۔ (۶) شوقی ابوخلیل، جرجی زیدان فی المیزان، ص ۳۰۷-۳۱۵، دار الفکر دمشق، ۱۹۸۰ء۔ (۷) جرجی زیدان، تاریخ آداب اللغة العربية، الجزء الأول، ص ۲۱-۳۰، مؤسسة هنداوی للتعليم والثقافة مصر، ۲۰۲۱ء۔

”مدرسہ عالیہ رامپور“

(ماضی وحال کے آئینہ میں)

جناب جنید احمد☆

روہیل کھنڈ افغانستان کے پہاڑی علاقے ”روہ“ کی طرف منسوب ہے، اسی علاقہ سے ہندوستان آنے والوں کو روہیلہ کہا جاتا تھا۔(۱) ۱۷۰۷ء میں سب سے پہلے سردار داؤد خاں روہیلہ ہندوستان آئے۔سردار داؤد خاں اوران کے جانشینوں کے ماتحت روہیلہ افغانوں کی ایک بڑی جمعیت ”کٹھیر“ میں جمع ہوتی چلی گئی۔کٹھیر کا خطہ رامپور، مرادآباد، سنبھل، بجنور، بریلی، بدایوں، شاہجہانپور اور پیلی بھیت کے اطراف وجوانب پر مشتمل تھا۔(۲)

ریاست روہیل کھنڈ کے بانی اور سردار داؤد خاں کے جانشین سردار علی محمد خان روہیلہ (م ۱۷۴۹ء) کو مغلیہ حکومت کی جانب سے کٹھیر کی جاگیرداری کا پروانہ ملا تو یہ علاقہ ”روہیل کھنڈ“ کے نام سے مشہور ہوا۔نواب علی محمد خان کے انتقال کے بعد یہ ریاست روہیلہ سرداروں کے درمیان تقسیم ہوگئی۔شاہ آباد اور رام پور کے اطراف واکناف نواب فیض اللہ خان (م ۱۷۹۴ء) کے حصہ میں آئے۔ رامپور جس کا قدیم نام ”مصطفیٰ آباد“ تھا نواب فیض اللہ خان کی ریاست کا مرکز بنایا گیا۔جس پر نواب موصوف کا خاندان آزادی ہند تک نوابی و جاگیرداری کرتا رہا۔ریاست روہیل کھنڈ میں روہیلوں کی بے شمار نشانیاں تعمیرات ومختلف مظاہر فنون لطیفہ کی شکل میں موجود ہیں خصوصاً شہر رامپور تہذیب وثقافت اور فنون لطیفہ کا عظیم الشان شاہکار ہے۔رامپور میں جامع مسجد، قلعہ، رضا لائبریری اور مدرسہ عالیہ روہیلوں کی عظمت رفتہ کا پتہ دیتی ہیں۔

رامپور اگرچہ چھوٹی سی ریاست تھی،لیکن برصغیر اور دوسرے ملکوں میں اس کی شہرت کی بڑی

☆ ریسرچ اسکالر، ہمدرد یونیورسٹی، نئی دہلی۔

وجہ مدرسہ عالیہ ہے،"مدرسہ عالیہ" کا قیام نواب فیض اللہ خاں کے عہد (۱۷۷۴ء تا ۱۷۹۴ء) میں ہوا، اس مدرسہ کے قیام کا پس منظر یہ ہے کہ بحرالعلوم ملا عبدالعلی فرنگی محلی (م ۱۲۲۵ھ-۱۸۱۰ء) فراغت کے بعد روہیلہ نواب حافظ الملک حافظ رحمت خان کے پاس شاہجہاں پور آ گئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔حافظ رحمت خاں کے انتقال (م ۱۱۸۸ھ-۱۷۷۴) کے بعد نواب فیض اللہ خاں بانی ریاست رامپور کی استدعا پر رامپور تشریف لا کر مسند درس کو رونق بخشی اور مدرسہ عالیہ کے پہلے پرنسپل ہوئے۔(۳)

ملا بحرالعلوم کی مسند درس کی وجہ سے اس محلہ کو "مدرسہ محلہ" کہا جانے لگا۔اس زمانے تک اس مدرسہ کا نام "مدرسہ عالیہ" نہیں ہوا تھا بلکہ صرف مدرسہ یا زیادہ سے زیادہ مدرسہ عربی کہلاتا تھا۔نواب محمد سعید خان (م ۱۲۷۱ھ-۱۸۵۵ء) کے عہد میں اس کا نام "مدرسہ عالیہ" ہو گیا۔(۴)

ملا عبدالعلی فرنگی محلی رامپور میں تقریباً پانچ سال رہے۔ان ہی کا فیض تھا کہ مختلف دیار و امصار سے علماء و طلبہ برابر آتے رہے۔طلبہ حصول علم اور اساتذہ مصروف درس ہوئے۔اس دور میں رامپور کے متعدد مقامات پر علماء و اساتذہ نے کثرت سے حلقہ ہائے درس قائم کیے۔اس طرح کے علما کی تعداد تقریباً پانچ سو کے قریب تھی۔ان حضرات کو ریاست کی طرف سے وظیفے ملتے تھے۔

مولانا عبدالسلام رامپوری سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ ان مختلف حلقہ ہائے درس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

> "یہ انفرادی حلقے بھی مدرسہ عالیہ کے ہی تھے۔مدرسہ کی عمارت کے باوجود اساتذہ کے لیے وہاں بیٹھ کر درس دینا ضروری نہ تھا لیکن ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۷ء کے مابین جس وقت جنرل عظیم خان (م ۱۳۰۸ھ-۱۸۹۱ء) ریاست کے مدارالمہام (وزیر اعلیٰ) ہوئے تو انہوں نے مدرسہ عالیہ کی تنظیم نو کی اور اساتذہ کو مخصوص عمارت میں اوقات مقررہ پر حاضر ہونے پر آمادہ کیا جو علما اس پر راضی ہوئے ان کو مدرسہ کا استاذ قرار دیا گیا اور باقی کو معلمی سے خارج کر دیا گیا۔بعض اساتذہ کو یہ اس قدر ناگوار گزرا کہ وہ گھر میں بیٹھ گئے۔انہیں میں مولانا ارشاد حسین رامپوری کے داماد سید ارشد علی (م ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء) بھی تھے"۔(۵)

"مدرسہ عالیہ" کے متعدد حلقہ ہائے درس تھے، اس کے زیادہ تر اساتذہ محض تدریسی خدمات انجام دیتے تھے۔ لیکن بعض اہم شخصیتوں کو ریاست کی دوسری خدمتیں بھی سپرد کر دی جاتی تھیں۔

طلبہ کے قیام و طعام کی کفالت اہل شہر سے متعلق تھی۔ ریاست کی طرف سے بھی طلبہ کی ایک تعداد کی وظائف وغیرہ سے امداد ہوتی تھی، چونکہ یہ ریاست ایک روہیلہ ریاست تھی اور حلقہ ہائے درس کے اساتذہ کی اکثریت سرحد آزاد اور افغانستان سے متعلق تھی اس وجہ سے طلبہ کی تعداد ابتداءً ان علاقوں سے رہی۔ بعد کے ادوار میں ملک کے دوسرے حصوں سے بھی طلبہ آتے رہے۔

مدرسہ عالیہ کے لیے ایک خاص عمارت ہمیشہ سے رہی تاہم یہ مدرسہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر بھی برابر منتقل ہوتا رہا۔ مدرسہ محلہ کی جس عمارت میں یہ قائم کیا گیا تھا اور جہاں ملا بحر العلوم درس دیا کرتے تھے وہاں ۱۷۹۴ء میں نواب محمد علی خاں بن فیض اللہ خان کو دفن کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ عمارت پوری کی پوری مقبرے کی صورت اختیار کر گئی۔ لہٰذا مدرسہ، صاحبزادہ احمد یار خان (م ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء) کے محل سرا میں منتقل ہو گیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جب قلعے کی تعمیر شروع ہوئی تو یہ محل سرا قلعے میں شامل ہو گیا اور مدرسہ جامع مسجد میں منتقل کرنا پڑا، مسجد کی تعمیر نو ہوئی تو یہ مدرسہ تقریباً ۱۹۱۳ء میں حیدر علی خاں (م ۱۸۹۷ء) کے محل سرا، ظفر منزل کی نچلی منزل میں آ گیا۔ اس کی بالائی منزل میں انگریزی مدرسہ چلتا رہا۔ اس کے بعد جب غلے کی منڈی پرانا گنج سے ظفر منزل میں منتقل ہوئی تو صاحبزادہ عبدالعلی خاں بن غلام محمد خان کے محل سرا واقع شیخ کی پھڑ، پرانا گنج میں مدرسہ منتقل ہو گیا۔ بعد میں یہ عمارت مدرسہ کو مستقل دے دی گئی۔ ۱۹۴۷ء تک مدرسہ یہیں رہا۔ پھر مدرسہ کی تعمیر و مرمت کی وجہ سے مدرسہ کے درجات کو قلعے کے متصل "کلب گھر" نام کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ پہلی عمارت کے منہدم ہونے اور اس پر بعض افراد کے قبضہ کی وجہ سے مدرسہ کلب گھر میں ہی چلتا رہا۔(۶)

۱۸-۲۰۱۷ء میں دوران تحقیق جب راقم الحروف مدرسہ عالیہ کی مذکورہ عمارت کلب گھر میں پہنچا تو وہاں رامپور پبلک اسکول کا بورڈ لگا تھا معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اب یہاں پرائمری اسکول چلتا ہے اور مدرسہ عالیہ رضا ڈگری کالج میں منتقل ہو چکا ہے۔ رضا ڈگری کالج میں زبیر صاحب نام کے ماسٹر صاحب چند پرائمری طلبہ کو لیے بیٹھے تھے۔ اس طرح یہ عظیم الشان اور تاریخی ادارہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔

مدرسہ عالیہ سے ملک کے مشہور ترین علمائے کرام متعلق رہے ہیں جنھوں نے یہاں سے علوم اسلامیہ کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔بعض نے تو رامپور ہی کو اپنا وطن بنالیا جن کے اخلاف آج بھی رامپور میں موجود میں ہیں۔مدرسہ کے سربراہ اور اساتذہ دونوں طرح کے حضرات کی فہرست طویل ہے یہاں چند علما کے اسما پیش کیے جارہے ہیں۔

ملا بحر العلوم عبدالعلی فرنگی محلی شاہجہانپور سے رامپور تشریف لائے یا ان سے یہاں آنے کی درخواست کی گئی۔انہوں نے مدرسہ عالیہ کی بنیاد ڈالی۔مدرسہ کی تاسیس کو زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ آپ کے درس کی شہرت اور علمی فیضان نے مدرسہ کو شہرت سے ہمکنار کرادیا۔چند سالوں میں یہ ادارہ ہندوستان میں علوم مشرقیہ کے نہایت ممتاز علمی مراکز میں شمار ہونے لگا۔

ملا بحر العلوم عبدالعلی رحمہ اللہ کی غیر معمولی شخصیت اور اس کی تاثیر ونفوذ کا اندازہ مدرسہ عالیہ کی ترقی وشہرت کے علاوہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ارکاٹ کے نواب نے جنوب ہند میں آنے کی دعوت دی وہ وہاں تشریف لے گئے اور چنیا پٹن میں مدرسہ قائم کر کے درس دینا شروع کیا تو چاروں طرف سے طالبان علم کا ہجوم ہوگیا اور اس مدرسہ کی ایسی شہرت ہوئی کہ چنیا پٹن کا نام ہی مدرسہ پڑ گیا جو بعد میں ''مدراس'' ہوگیا اور اب اسے چنئی نام دے دیا گیا ہے۔(۷)

ملا عبدالعلی کے بعد یہاں ان کے رشتے کے چچا ملا محمد حسن بن غلام مصطفی شاگرد ملا نظام الدین سہالوی مدرسہ کے سربراہ ہوئے۔۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء میں ملا محمد حسن نے وفات پائی تو مفتی شرف الدین رامپوری کو یہ ذمہ داری سپرد کردی گئی۔علوم شرعیہ کے ساتھ علوم معقولات میں بھی انھیں خصوصی مہارت حاصل تھی۔مدرسہ کی سربراہی کے ساتھ وہ ریاست کے صدر الصدور بھی رہے۔مفتی شرف الدین رامپوری کے بعد کچھ عرصہ تک مدرسہ کی صدر نشینی خالی رہی۔لگ بھگ ۱۸۴۰ء میں مولانا عبدالقادر چیف (م ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء) مدرسہ کے صدر ہوئے۔مدرسہ کی صدارت کے ساتھ وہ دیوانی اور فوجداری کے مفتی اور پھر حاکم مرافعہ بھی ہوگئے۔(۸)

مایہ ناز علمی شخصیت علامہ فضل حق خیرآبادی (م ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کی بھی خدمات مدرسہ کو حاصل ہوئیں۔علامہ فضل حق خیرآبادی کا تعلق نوابان رامپور سے پہلے ہی سے تھا۔علامہ موصوف جس وقت دہلی میں سررشتہ دار عدالت دیوانی تھے اور ان کے والد علامہ فضل امام خیرآبادی (م ۱۲۴۴ھ/

۱۸۲۹ء) صدر الصدور تھے اسی زمانے میں نواب محمد سعید خاں (م ۱۸۵۵ء) حکومت انگریزی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ دہلی میں دونوں کے تعلقات ہوئے۔ نواب سعید خان نے اپنے بیٹے نواب یوسف علی خان (م ۱۸۶۵ء) کو بغرض حصول تعلیم دہلی بھیجا۔ نواب یوسف خاں نے کچھ علامہ فضل حق خیرآبادی اور کچھ مفتی صدر الدین آزردہ سے حاصل کی۔ نواب احمد علی خاں کے انتقال (۱۸۴۰ء) کے بعد نواب سعید خاں والی ریاست ہوئے تو انہوں نے علامہ فضل حق خیرآبادی کو رامپور بلا لیا۔ ابتدا میں وہ حاکم نظامت رہے پھر محکمہ قضا، مرافعہ عدالتیں اور مدرسہ عالیہ کے صدر رہے۔ ۱۸۴۸ء تک وہ ان عہدوں پر فائز رہے پھر ۱۸۵۷ء میں ملوث افراد کی داروگیر شروع ہوگئی اسی سلسلہ میں علامہ کے ساتھ مدرسہ عالیہ کے ایک اور نامور استاذ مفتی عنایت احمد کاکوروی (م ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء) کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کے کالا پانی بھیج دیئے جانے کے بعد ان کے خلف شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی ۱۲۸۱ھ تا ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۶۴ء تا ۱۸۸۸ء مدرسہ عالیہ کے پرنسپل رہے۔ اسی دور میں یہ عہدہ "پرنسپل" کے نام سے موسوم ہوا۔ کچھ دنوں مفتی لطف اللہ رامپوری (م ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) اور ان کے استعفیٰ کے بعد مولانا حفیظ اللہ ندوی اعظم گڑھی پرنسپل ہوئے۔ ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶ء میں نواب حامد علی خاں نے مولانا عبدالحق خیرآبادی کو دوبارہ طلب کیا اور دو سال وہ پھر سے پرنسپل رہے۔ ۱۸۹۸ء میں مولانا اسدالحق بن عبدالحق خیرآبادی کو صدر بنایا گیا مگر دو ہی سال بعد ان کا انتقال ہو گیا اس طرح خیرآبادی تین نسلوں نے مدرسہ عالیہ کی خدمات انجام دی اور مدرسہ عالیہ کی علمی ترقی میں حصہ لیا۔

ان حضرات کے بعد یکے بعد دیگرے سید عبدالعزیز امیٹھوی (م ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ء) مستعفی ۱۹۱۰ء، مولانا ہدایت رسول بریلوی (م ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء) مستعفی ۱۹۱۱ء اور مولانا فضل حق رامپوری کئی مرتبہ برخاست اور بحال ہوئے۔ نواب حامد علی خاں کے اصرار پر وہ آخری مرتبہ پرنسپل ہوئے اور تاحیات عہدہ پر فائز رہے۔ ان کا انتقال ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء میں ہوا۔ درمیان میں مولانا ظہورالحسن رامپوری (م ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۳ء) بھی مدرسہ عالیہ کے پرنسپل رہے۔ مولانا عبدالودود جیراج پوری مستعفی ۱۹۴۴ء، شمس العلماء عبدالرحمٰن دہلوی مستعفی ۱۹۴۸ء عہدہ صدارت پر مامور ہوئے۔

۱۹۴۷ء کے آس پاس مدرسہ کا انتظام ردوبدل سے دوچار ہوتا رہا اور کئی حضرات اس عہدہ پر فائز رہے کچھ حضرات کو عارضی ذمہ داری بھی دی گئی۔ جن میں مولانا وجیہ الدین خاں رامپوری (م

۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء)، سید محمد ودود زنگی پوری مستعفی ۱۹۵۳ء، سید عبدالدائم جلالی (م ۱۹۸۳ء) اور سید محسن نواب (م ۱۹۶۹ء) مستعفی ۱۹۵۲ء شامل ہیں، مؤخرالذکر پہلا شیعی تقرر تھا انھوں نے کئی اور بھی شیعہ اساتذہ کا تقرر کیا جس کی وجہ سے عام ناراضگی پھیل گئی اور آخر کار ان کو مستعفی ہونا پڑا، مولانا عبدالمؤمن مستعفی ۱۹۵۳ء، مولانا عبدالسلام خاں رامپوری مستعفی ۱۹۷۵ء بھی اس عہدہ پر فائز ہوئے۔

مدرسہ عالیہ اس دوران لوگوں کی عدم توجہ کا شکار ہوتا چلا گیا، حکومت نے بھی اس میں نااہل اساتذہ کا تقرر کیا جس سے یہ عالی شان اور تاریخی مدرسہ زوال پذیر ہوگیا۔ مولانا عبدالسلام خاں رامپوری کے سبک دوش ہونے کے بعد پبلک سروس کمیشن نے عرصہ دراز تک کسی کا تقرر نہیں کیا اور یہ عہدہ خالی پڑا رہا ہے اساتذہ ہی بلحاظ تقدم ملازمت پرنسپل کے عہدے کی ذمہ داری سنبھالتے رہے۔

راقم الحروف نے ۲۶/اگست ۲۰۱۹ء کو مدرسہ عالیہ کے سابق پرنسپل قاری راشد رامپوری سے بات کی تو انھوں نے بتایا کہ کافی عرصہ تک مدرسہ کا نظم یوں ہی چلتا رہا پھر نورالدین نظامی پرنسپل کے لیے منتخب ہوئے اور ۱۹۹۵ء میں سبک دوش ہوئے۔ کچھ دنوں کے لیے میں بھی عارضی طور پر یہ ذمہ داری سنبھالتا رہا اور پھر ۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۴ء تک مستقل پرنسپل کے عہدہ پر تقرر ہوگیا۔ انھوں نے بتایا کہ اس دوران مدرسہ عالیہ میں درس نظامی پڑھانے کی صلاحیت رکھنے والا کوئی استاذ موجود نہ تھا البتہ پرائمری کے طلبہ کے ساتھ کچھ عربی کے طلبہ بھی تھے جن کی تعلیم کے لیے خاکسار مولوی ثناء اللہ رامپوری، مولوی مظہراللہ رامپوری اور مولوی سلامت جان رامپوری سے علمی تعاون لیا گیا۔

قاری راشد صاحب نے بتایا کہ مدرسہ عالیہ سے میرے جانے کے بعد کچھ دنوں حسن محمد عابدی صاحب عارضی طور پر یہ عہدہ دیکھتے رہے۔ محمد اخلاق صاحب جو عالیہ کے شعبہ حفظ کے استاذ تھے تعلقات کی بنیاد پر پرنسپل ہوئے اور ۲۰۰۹ء میں ریٹائر ہوگئے۔

راقم نے ۱۳-۲۰۱۲ء میں مدرسہ عالیہ رامپور سے فاصلاتی امتحان کے تحت فاضل حدیث کیا تھا، لہٰذا مدرسہ عالیہ جانے کا کئی مرتبہ موقع ملا۔ اس دوران مدرسہ میں درس نظامی کا امتحان ہوتا تھا اور باقاعدہ طلبہ کو ایڈمیشن بھی دیا جاتا تھا لیکن مدرسہ میں نہ کسی عالم کا تقرر ہوا تھا اور نہ ہی کسی حافظ کا۔ تقرر کے نام پر چند ماسٹر حضرات تھے۔ درس نظامی کے طلبہ کے لیے عارضی اساتذہ کا انتظام انہیں ماسٹر حضرات نے کر رکھا تھا۔ میں نے مولانا عارف جمالی اور مولانا حفظ الرحمن صاحبان کو مدرسہ میں دیکھا

ہے۔ یہ دونوں حضرات درس نظامی کے طلبہ کو کبھی کبھی درس دیا کرتے تھے۔ البتہ مدرسہ میں لائبریری موجود تھی جہاں اسلامیات کی کثیر کتب وشروحات تھیں۔ طلبہ ان سے استفادہ کرتے تھے۔ ۲۰۱۷ء میں یہ حضرات بھی وہاں سے ہٹادیے گئے اور مدرسہ بھی ۲۰۱۸ء میں رضا انٹر کالج کو منتقل کردیا گیا۔

مدرسہ عالیہ کا نصاب وہی تھا جس کو "درس نظامی" سے جانا جاتا تھا۔ طلبہ کی استعداد، ضرورتوں اوراس کے سربراہوں کے ذوق وصواب دید کے لحاظ سے کمی بیشی ہوتی تھی۔ چونکہ مدرسہ عالیہ میں معقولات کے اساتذہ وسربراہ زیادہ رہے ہیں، لہٰذا نصاب پر بھی اس کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے لیکن نصاب کی کمی بیشی میں بنیاد کو نظرانداز نہیں کیا گیا۔

علم تفسیر، حدیث، منطق وفلسفہ، عقائد وکلام، جغرافیہ، حساب، تاریخ، عربی ادب، فارسی ادب، اردو ادب کے ساتھ فقہ واصول فقہ کی کتابوں کا بڑا حصہ شامل درس تھا۔ مدرسہ عالیہ میں جو فقہی کتابیں داخل نصاب تھیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

مالابد منہ، قدوری، شرح وقایہ اول، دوم، کنز الدقائق، اصول الشاشی، نورالانوار، ہدایہ اولین وآخرین، سراجی، التوضیح والتلویح وغیرہ۔ (۹)

مختلف اوقات میں مدرسہ عالیہ کے نصاب میں ترمیم اور نظر ثانی ہوتی رہی ہے، سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں نواب محمد اسحاق خاں مدارالمہام ریاست رامپور کی سرکردگی میں جائزہ لیا گیا اور فارسی کا قدیم نصاب منسوخ کردیا گیا اور پنجاب یونیورسٹی کے نصاب منشی، منشی عالم، منشی فاضل کا افتتاح ہوا ساتھ ہی اس یونیورسٹی کے عربی درجات مولوی، عالم، فاضل کا اضافہ ہوا۔

۱۹۰۹ء میں درجہ تکمیل کے نام سے ایک شعبہ کا اضافہ ہوا، ۱۹۲۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کے نصاب و درجات کی جگہ عربی فارسی بورڈ الٰہ آباد نے لے لی، ۱۹۳۰ء میں جزئی ترمیمات ہوئیں۔ ۱۹۳۲ء میں نواب رضا علی خاں کے حسب ایما ریاستی وزارت نے مدرسہ عالیہ کے اعلیٰ اور متوسط درجوں کو محدود کردیا اور ابتدائی ناظرہ وحفظ اور خطاطی کے درجوں کو توڑ دیا گیا۔

مدرسہ عالیہ اوراس کے فارغین نے علوم مشرقیہ کی بڑے پیمانے پر خدمات انجام دیں۔ بعض حضرات کے اسما پیش کیے جارہے ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے شہرت پائی:

۱۔ مولوی احمد علی چریا کوٹی (م ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء) ۲۔ ملا عجب گل خاں (م ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۶۰ء)

۳۔مولانا فیض الحسن سہارنپوری (م ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء) ۴۔حکیم محمد اعظم خاں (م ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء) مصنف محیط اعظم وغیرہ ۵۔حکیم نورالدین قادیانی خلیفہ اول غلام احمد قادیانی (م ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء) ۶۔مولوی عبدالحق حقی وصفا (م ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء) ۷۔محمد طیب مکی (م ۱۳۳۴ء-۱۹۱۶ء) ۸۔عبدالجبار خاں آصفی (م ۱۳۴۲ء/ ۱۹۲۴ء) مصنف تذکرہ محبوب الزمن وغیرہ ۹۔مولانا ظہور الحسین رامپوری (م ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء) ۱۰۔مولوی نجم الغنی خان رامپوری (م ۱۳۵۹ھ/ ۱۹۴۰ء) مصنف اخبار الصنادید و تاریخ اودھ وغیرہ ۱۱۔مولانا محمد علی جوہر (م ۱۹۳۱ء) ۱۲۔مولانا افضال الحق (م ۱۳۷۵ء/ ۱۹۵۶ء) ۱۳۔مولانا عبدالدائم جلالی (م ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) ۱۴۔مولانا وجیہ الدین خاں رامپوری (م ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء)۔(۱۰)

ان چند حضرات کے علاوہ "تذکرہ کاملان رامپور" و دیگر کتب تاریخ وسوانح میں ایسے کثیر علما کا تذکرہ مل جائے گا جن کا تعلق مدرسہ عالیہ سے رہا ہے۔مگر افسوس یہ ادارہ جو کبھی ۱۸۵۷ء سے قبل یونیورسٹی کی طرح تھا اور جس کی علمی فضا نے رامپور کو بخارائے ہند کے لقب سے ملقب کیا تھا۔اب یہ اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہا ہے۔

حوالے وحواشی

(۱) رضا لائبریری، جرنل نمبر ۳ مضمون شجاعان روہیل کھنڈ، از دلدار نصری، فروری ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۱، یہ علاقہ اب دو ملکوں میں منقسم ہے، کابل، قندھار اور جلال آباد افغانستان میں جبکہ پشاور، مرداں، نوشیرہ، باجوڑ اور وزیرستان پاکستان میں شامل ہے۔(۲) اخبار الصنادید، از مولوی حکیم نجم الغنی خاں رامپوری، رضا لائبریری، رامپور ۲۰۱۶ء، جلد اول، ص ۹۷۔ (۳) عربی زبان وادب میں روہیل کھنڈ کا حصہ، از ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی، پرنٹ لوجی انک، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۳۹۔ (۴) مدرسہ عالیہ رامپور ایک تاریخی درسگاہ، از مولانا عبدالسلام خان رامپوری، ص ۹۔(۵) مصدر سابق، ص ۲۰۔ (۶) مصدر سابق، ص ۹-۱۰۔(۷) مصدر سابق، ص ۸۔(۸) تذکرہ کاملان رامپور، از حافظ احمد علی خاں شوق، ص ۲۳۵۔(۹) مدرسہ عالیہ رامپور ایک تاریخی درسگاہ، ص ۲۳ تا ۲۸۔(۱۰) مصدر سابق، ص ۱۸، ۱۹۔

کلام اقبال کے مغربی مشاہیر

جناب ظفر اقبال نحوی☆

اقبال کی قدر و منزلت اردو اور فارسی کے سر برآوردہ شعرا میں ایک مسلم الثبوت شاعر اور فلسفی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حیثیت تک پہنچنے کے لیے ان کو دنیا کے بیشتر نامور شاعروں اور مفکروں کا غائر نظر سے مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔ اس مطالعہ میں بہت سے ایسے مقامات آئے ہوں گے جہاں خیالات میں تردید و تائید یا توافق و تصادم کی صورتیں پیدا ہوئی ہوں گی اور ذہن نے ان کا منفی یا مثبت اثر قبول کیا ہوگا، چنانچہ ان کے کلام و پیام کے مطالعے سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے دنیا کے بے شمار صاحب نظر افراد سے اپنے ذوق کے مطابق استفادہ کیا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے استفادے کی نوعیت ہمیشہ ان کے عقیدۂ توحید و رسالت کی پابند رہی ہے اور علمائے شعر و حکمت کے وہی خیالات ان کی توجہ کا مرکز بنے ہیں جو قرآن و سنت کی تعلیمات سے کسی نہ کسی رخ سے مماثل و مشابہ تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان اپنی معروف تصنیف "روح اقبال" کے دیباچہ میں بیان کرتے ہیں کہ میں نے اقبال کے خیالات کو اپنے مطالعہ کی سہولت کے مدنظر تین شقوں کے تحت تقسیم کیا ہے یعنی آرٹ، تمدن اور مذہب، وہ کہتے ہیں کہ ان تین شقوں کے تحت زندگی اور کائنات کے تمام مہمات مسائل آجاتے ہیں، جن کی نسبت اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے(۱)۔ اقبال نے اپنے فکر و فلسفہ کی تعمیر و تشکیل میں جہاں قرآن و سنت اور بعض اسلامی مفکرین یا اسلامی تحریکات سے استفادہ کیا ہے، وہاں ان کے ذہنی اور فکری ماخذوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ عالمی مفکرین میں اقبال نے افلاطون سے لے کر برگسان تک کے تمام فکری رہنماؤں سے اخذ و استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے ان مطالعاتی افادات کو اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں ایک ایسا فکری تناظر فراہم کیا ہے جس میں زمانے کے بدلتے ہوئے رویوں کا حل تلاش کرنے کی بصیرت افروز تعبیر موجود ہے۔

☆ ریسرچ اسکالر بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری، جموں کشمیر۔ ۱۸۵۲۳۴، موبائل: ۹۶۸۲۱۰۷۳۸۶۔

فکر اقبال کی صحیح تفہیم کے لیے ان اکابر و اساطین کا مطالعہ ضروری ہے جن کا ذکر اقبال نے اپنے کلام میں کیا ہے اور جن سے انھوں نے منفی یا مثبت اثر قبول کیا۔ ان فلسفیوں میں افلاطون کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ چنانچہ اقبال نے افلاطون کو جہاں احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے وہیں ان پر سخت تنقید بھی کی ہے۔ انھوں نے اسرار خودی میں افلاطون کو راہب دیرینہ اور گوسفند قدیم کا لقب دیا ہے:

؎ راہب دیرینہ افلاطون حکیم از گروہ گوسفندانِ قدیم (۲)

اقبال کے خیال میں افلاطون نے تصوف اور ادبیات اسلامی پر ایک منفی اثر ڈالا جو تصوف کے ذریعے رہبانیت اور ترک دنیا کی طرف چل پڑا۔ اس لیے افلاطون کے خیالات سے اقوام اسلامیہ کا احتراز واجب ہے۔ اقبال ایک طویل حکایت کے ذریعے اس چیز کا انکشاف کرتے ہیں کہ اس طرح غالب قومیں انحطاط کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ افلاطون کے نظریات نے ہمارے صوفیہ خاص کر ابن عربی کے ذہن کو کافی متاثر کیا۔ یہاں تک کہ ابن عربی نے افلاطون کے نظریات کو قرآن کریم کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی سعی بھی کی تھی۔ اقبال ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ”عقل افلاطون نے گردوں تک رسائی حاصل کی اور عالم اسباب یعنی دنیا کو ایک افسانہ وافسوں کے نام سے یاد کیا۔ افلاطون نے اس طرح زیان کو سود کہا اور اس کی حکمت نے بود کو نابود ثابت کیا۔ اس کی فطرت خوابیدہ تھی اور اس کا فلسفہ خواب آور تھا۔ اس کے چشم ہوش نے ایک شراب پیش کی۔ چونکہ افلاطون ذوق عمل سے محروم تھا اس کی روح وارفتہ ومحروم ہوئی۔ وہ ہنگامہ موجود یعنی عالم کی حقیقت سے منکر تھا۔ اس لیے انھوں نے ”اعیان مشہود“ کا فلسفہ تخلیق کیا“۔ (۳)

اقبال کے فکری ماخذوں میں برگسان کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ یقیناً برگسان کے نتائج علمی فکر اقبال کی تنقیح میں گہرے اثرات رکھتے ہیں۔ برگسان نے بیسویں صدی میں زندگی کی مادی تعبیر عقل پر ضرورت سے زیادہ زور اور جسم و روح کی ثنویت کو ادا کر کے اقبال کو تقویت دی کیونکہ برگسان فکری طور پر تعمیری تھا۔ بقول بشیر احمد ڈار:

> ”اقبال کو برگسان کی جس بات نے فریفتہ کیا وہ یہ تھی کہ برگسان انسانی شعور کی زیادہ گہری سطحوں کا پرزور حامی تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کیا جا سکتا ہے کہ وہ حیات انسانی کے روحانی پہلو اور وجدان کے اس کام کا بڑا قائل تھا جو حر کی تجربے کو

معرضِ وجود میں لاتا ہے''۔(۴)

اور یہ بھی کہ:

''برگسان نے ٹھوس حقائق کی بنیادوں پر ارتقا کے اس نظریے کی وضاحت کی جس کے بارے میں مغرب کو امید تھی کہ یہ مذہب کے تابوت میں آخری کیل تھی''۔(۵)

برگسان سے ملاقات کے دوران جب اقبال نے ''زمانے کو برا مت کہو زمانہ تو میں خود ہوں'' والی حدیث سنائی تو وہ حیرت زدہ ہوگیا۔ برگسان نے سائنس اور مادیت کے خلاف جو مورچہ قائم کیا اس میں اقبال کے اپنے فکر کے لیے بڑی توانائی تھی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اقبال اور برگسان کے ذہنی قرب و بعد میں بڑی عمدگی کے ساتھ ان تحریکات کا سراغ لگایا ہے جو اقبال اور برگسان میں مشترک تھیں اور ان دونوں کے ذہنی فاصلے بھی عیاں کیے ہیں۔ چنانچہ اقبال حیات و کائنات، زمان و مکان اور فرد و ملت کی حقیقت و تعلق پر اسی طرح غور و فکر کرتے رہے جس طرح برگسان کر رہا تھا۔ فرمان فتح پوری برگسان کے اقبال پر اثرات کا نچوڑ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''برگسان سے اثر قبول کرنے کا یہ مفہوم نہیں کہ اقبال اس کے مقلد ہیں۔ اقبال نے چراغ سے چراغ روشن کیا ہے لیکن ان کے چراغ کی نوعیت و روشنی برگسان سے بہت مختلف ہے، اس لیے اسے تقلید یا سرقے کا نہیں صرف استفادے کا نام دیا جائے گا۔ استفادے کی بھی صورت یہ ہے کہ اقبال نے برگسان کا کوئی خیال جوں کا توں نہیں لیا بلکہ خیال کے بعض اجزا لے کر ذاتی تخیل و تفکر کی مدد سے حیات و کائنات کے متعلق برگسان سے الگ ایک نقطۂ نظر پیش کیا ہے''۔(۶)

برگسان کے بعد نٹشے مغرب کے ایک اہم مفکر ہیں، جنھوں نے اقبال کے افکار پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اقبال نے نٹشے کی تحریروں سے براہ راست اخذ و استفادہ کیا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے ان میں سے بعض مضامین کی نشاندہی بھی کی ہے جو نٹشے سے ماخوذ ہیں مثلاً اسرار خودی میں مسئلۂ نفی خودی، افلاطون پر تنقید، خودی کی تربیت کے تین مراحل، پیاس سے بے تاب پرندے کی کہانی 'الماس اور شبنم اور حکایت الماس و زغال' نٹشے ہیں، ان کے بارے میں خود اقبال نے اشارہ دیا ہے کہ یہ نٹشے سے ماخوذ ہیں۔ اقبال نے خودی، استقامت، عزم و ہمت اور سخت کوشی کے مضامین بھی نٹشے سے لیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے نٹشے کی تصنیفات سے بعض جگہ اسلوب، طرز بیان اور مضمون بھی اخذ کیا ہے۔

نٹشے کی طرح اقبال بھی جمہوریت سے گریزاں اور نالاں ہیں۔

نٹشے اور اقبال کے خیالات میں اگرچہ ہم آہنگی ہے لیکن نٹشے کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کے مرد بزرگ سے اقبال کے مرد مومن کو کوئی علاقہ ہے تو یہ اقبال اور نٹشے دونوں سے عدم آگاہی کی چغلی کھاتا ہے، کیونکہ جب اقبال نٹشے کو مجذوب فرنگی کہتے ہیں اور مقام کبریا سے اس کے آگاہ نہ ہونے کی بات کرتے ہیں تو وہ نٹشے کی روحانی اور فکری واماندگی کو آشکار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نکلسن کے نام خط میں اقبال نے خود اس صورت حال کو واشگاف کیا ہے:

> ''وہ انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خلط مبحث کرکے میرے انسان کامل اور جرمن فکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز کرلیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً ۲۰ سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا اور نہ اس کی کتابیں میری نظر سے گزری تھیں''۔(۷)

غالباً اقبال کے اس تجزیے کے بعد یہ کہنا غلط ہوگا کہ اقبال نے مرد مومن کا تصور نٹشے سے لیا ہے۔ اس لیے کہ فوق البشر اندھی میکانکی قوت کا نام ہے جب کہ مومن وحی سے مرصع اور خدا پرست انسان ہے جس کی انتہا ابدیت ہے۔ اقبال کی نظر میں اطلاقی دنیا میں مرد مومن کا تصور حضورؐ کی ذات ہے جو وحی الٰہی سے مستنیر، اخلاقی رفعت کی مالک اور انقلاب پرور ہے اور جو اپنے عمل سے نئے اقدار حیات کی نشوونما کرتی ہے جبکہ نٹشے کا فوق البشر عملی تعبیر میں ہٹلر تھا جو اقدار اور قوت کا حریص ہے اور اس کے لیے سب کچھ کرگزرنے کو تیار ہے۔ اقبال کا مرد کامل نوع انسانی کے لیے رحمت لاتا ہے جبکہ نٹشے کا فوق البشر تباہ کن اندھی قوت ہے جو پوری دنیا کو اکھاڑ کر تباہی کا سامان فراہم کرتی ہے۔ عبدالرحمٰن طارق مرحوم نے اپنی کتاب ''جہان اقبال'' میں اقبال اور نٹشے کی تحریروں کے تقابل سے دونوں کے ذہنی بعد کو بڑی عمدگی سے واضح کیا ہے۔

مغرب کی جن ممتاز شخصیات نے اقبال کو متاثر کیا ان میں گوئٹے کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر این میری شمل نے اپنے جرمن ہونے کے ناطے اقبال اور گوئٹے کے فکری ڈانڈے بڑی مہارت سے ملائے ہیں انھوں نے اپنی کتاب ''گبریلز ونگ جس کا اردو میں شہپر جبریل'' کے نام سے ترجمہ کیا ہے میں اقبال اور گوئٹے کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ وہ گوئٹے کے تصور خدا کہ ''خدائے سرور سراپا

حرکت، سعی اور ابدی عمل میں ہے'' کو اقبال کے تصور خدا سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ دوسرے گوئٹے ارتقاے حیات کے لیے ابلیس اور شر کے وجود کو ضروری بتاتا ہے۔ تو اقبال بھی شر اور ابلیس کی افادیت پر صاد کرتے ہیں۔ بلا شبہ اقبال نے گوئٹے کی ایک وہبی شاعر اور علوم مشرقیہ کے طالب علم کی حیثیت سے تحسین کی ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ خود گوئٹے کی جب آرزوؤں اور فکری غایات کا مرکز و محور مشرقیات میں ہے تو پھر گوئٹے کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک تفہیم کار کی رہ جاتی ہے جب کہ اقبال اس کو اس کی ہی اصل مشرقی فکر کی طرف لے جاتے ہیں۔

اقبال تو گوئٹے کی توصیف ہی اس لیے کرتے ہیں کہ وہ مشرقیات کا دلدادہ ہے۔ گوئٹے کی مغرب سے مایوسی اور مشرق کی طرف رجوع اقبال کے لیے اہم بات رہی ہے، خود گوئٹے کے دیوان مغرب کو المانوی ادبیات کی تاریخ میں ''تحریک مشرق'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

> ''خواجہ حافظ کے علاوہ گوئٹے اپنے تخیلات میں شیخ عطارؔ، سعدیؔ، فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے''۔(۸)

اس طرح مغرب کے حوالے سے وہاں کے فکر و فلسفہ سے اقبال خوب استفادہ کرتے رہے، جن میں خاص طور پر وہاں کے مفکرین، فلسفی اور شعرا قابل ذکر ہیں۔ اقبال کا ذہن مقلدانہ نہ تھا بلکہ تخلیقی اور ارتباطی تھا۔ انھوں نے اپنے نظریات کی توثیق و تشریح کے لیے قدیم و جدید مفکرین کو اپنے ماخذ کے طور پر استعمال کیا۔ انھوں نے ان کے حاصلات فکر سے کھلی آنکھوں سے استفادہ کیا اور اس سلسلے میں تعصب کی پٹی آنکھوں پر نہ باندھی۔ ایک روشن دماغ مفکر کی طرح انھوں نے ہر اچھی بات کو قبول کیا اور ہر غلط بات پر تنقید کی اور یوں نوع انسانی کے فکر کی شمع فروزاں رکھنے کے لیے اپنی اعلیٰ ترین دماغی صلاحیت بروئے کار لائے۔

حواشی

(۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان، روح اقبال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۶۲ء ص۔(۲) محمد اقبال، کلیات فارسی، اسرار خودی، غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء ص ۳۲۔ (۳) ایس۔ ایم عمر فاروق، طواسین اقبال، جلد اول، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۷ء ص ۳۳۔ (۴) بشیر احمد ڈار، اقبال اور برگسان (مقالہ)، بزم اقبال لاہور (مرتب)، ص ۱۰۳۔ (۵) ایضاً، ص ۱۰۴۔ (۶) فرمان فتح پوری، اقبال سب کے لیے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء ص ۳۰۴۔ (۷) عبدالرحمٰن طارق، جہان اقبال، ملک دین محمد دارالاشاعت، لاہور، ۱۹۴۹ء ص ۱۹۔ ۲۰۔ (۸) اقبال، پیام مشرق، دیباچہ۔

اخبار علمیہ

''یہود مخالف مواد ہٹانے کا فیصلہ''

''ریسرچ انسٹی ٹیوٹ امپیکٹ سی'' کی ایک تازہ رپورٹ کے مطابق سعودی حکومت کی جانب سے نصابی کتب برائے ۲۱-۲۰۲۰ء میں پایا جانے والا نفرت انگیز مواد یا تو حذف یا تبدیل کردیا گیا ہے۔اس کا مقصد یہود مخالف میلانات ورجحانات میں اعتدال پسندی کی فضا ہموار کرنا بتایا جارہا ہے۔نصاب میں ایک عرصہ سے سامیت دشمنی پر مواد موجود تھا، جسے اب مکمل طور پر ختم یا الفاظ کی شدت کم کردی گئی ہے۔اسی طرح صیہونی خطرہ نامی باب بھی ختم کردیا گیا ہے،جس میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی تھی کہ اسرائیل دریائے نیل سے فرات تک کے علاقہ کو اپنا علاقہ مان کر اپنی ریاست کو وسعت دینے کا منصوبہ رکھتا ہے۔ہم جنس پرستی پر سزائے موت کی عبارت بھی ہٹادی گئی ہے۔اسی طرح جہاد اور شہادت کے لیے ہمیشہ تیار رہنے بالخصوص یہ عبارت کہ ''اللہ کی راہ میں جہاد اسلام کا عروج ہے'' کو ختم کردیا گیا ہے۔رپورٹ کے مطابق ۲۰۱۶ء سے ۲۰۲۰ء تک کی نصابی کتب میں اس قسم کا مواد اب بھی موجود ہے لیکن ان میں اعتدال پسندی اور رواداری کے نام پر اصلاحات کا آغاز کردیا گیا ہے۔امپیکٹ سی کے سربراہ مارکوس شیف کے بیان کے مطابق ۲۰۰۲ء سے ۲۰۱۹ء تک کی نصابی کتب کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ۲۰۲۰ء کی نصابی کتب کو جدید بنانے میں اعلیٰ اداروں کی کوششیں شامل ہیں۔رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سامیت دشمنی پر مشتمل مواد بھی نکال دیا گیا ہے جس میں اس بات کا تذکرہ تھا کہ یہودی جوڑ توڑ کرتے ہوئے دنیا میں اپنے مذموم عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی اور دنیا پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تبدیلیاں عارضی ہیں یا مستقل۔(اردو ٹائمز،ممبئی،۶/۱/۲۱ء،ص ۶)

''ایک غیر مسلم کا شوقِ کتابت''

حیدرآباد کے رہنے والے انیل کمار چوہان کو فن آرٹ اور ذوق کتابت ورثہ میں ملا ہے۔ان

کے نانا نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں اور دیگر اہم شخصیات کی پینٹنگ بنا چکے ہیں۔سری وینکٹیشورا کالج آف فائن آرٹس مادھاپور سے فائن آرٹس کی تعلیم حاصل کی ہے۔ان کے شوق کتابت کے متعلق یہ خبر دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ وہ دفتروں اور دوکانوں کے سائن بورڈس انگریزی،تیلگو، ہندی، مراٹھی کے ساتھ ساتھ عربی اور اردو میں بھی تحریر کرتے ہیں اور تقریباً ۱۷رسال کی عمر سے وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔انہوں نے باضابطہ اردو نہیں سیکھی ہے لیکن کتابت سیکھنے کی لگن اور جذبہ نے ان کو فن خطاطی میں مہارت دلائی۔ایک مرتبہ ان کے کسی دوست نے مسجد نور کے لیے کلمہ طیبہ اور خلفائے راشدین کا نام لکھنے کی فرمائش کی تو انہوں نے اس کو اپنی سعادت وخوش بختی سمجھ کر قبول کیا۔اس وقت سے اب تک ۱۵۰ مسجدوں میں کلمہ طیبہ اور خلفائے راشدین کے اسما اور آیاتِ قرآنیہ تحریر کر چکے ہیں، یوں تو وہ یہ کام بلاطلب منفعت کرتے ہیں تاہم ہدیہ کے طور پر قبول بھی کر لیتے ہیں۔بعض لوگوں کی جانب سے شروع میں مسجد جانے کی مخالفت ہوئی تو انہوں نے جامعہ نظامیہ سے رجوع کیا تو انہوں نے پاکی وطہارت کی شرط پر اجازت دے دی۔۱۹۹۷ء میں جامعہ نظامیہ کے قیام کے ۱۲۵ سال کی تکمیل کے موقع پر سورۂ یٰسین کا طغرہ جو ۶×۴ فٹ پر مشتمل ہے، نیو ماڈل ہائی اسکول کی انتظامیہ کی جانب سے جامعہ کو تحفۃً پیش کیا گیا تھا وہ انیل کمار ہی کا تحریر کردہ تھا۔(اعتماد،حیدرآباد ۱۵رفروری ۲۱ء)

''اسرائیل کی شرح غربت''

اسرائیل کا شمار یوں تو ترقی یافتہ اور ہر لحاظ سے مضبوط ممالک میں ہوتا ہے لیکن وہاں کی شرح غربت کے متعلق یہ خبر حیرت انگیز معلوم ہوئی کہ تقریباً ۲۰ لاکھ اسرائیلی شہری غریبی سطح سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ کل آبادی کا ۲۳ فیصد حصہ ہے۔اس میں اسرائیل کے ایک تہائی بچوں کی تعداد بھی شامل ہے،نیشنل انشورنس انسٹی ٹیوٹ کی رپورٹ کے مطابق اسرائیل کے عرب شہریوں میں غربت کی شرح قریب ۵۰ فیصد ہے، جو یہودی شہریوں کے بالمقابل دوگنی ہے،سماجی بہبود کے حکام نے نشاندہی کی ہے کہ کرونا وائرس کی وبا نے نہ صرف نچلے سماجی ومعاشی سطح کے افراد کو متاثر کیا ہے بلکہ دیگر بھی اس کی لپیٹ میں آئے ہیں۔ٹیکس کی شرحوں میں اضافے اور ۲۰۱۰ء میں اسرائیل کے اقتصادی تعاون اور ترقی کی تنظیم (او ای سی ڈی) میں شامل ہونے کے باوجود اسرائیل میں غربت کی

شرحوں میں کوئی بہتری نہیں آئی ہے، دریں اثنا ۲۷ دسمبر کو تیسرے لاک ڈاؤن کے آغاز کے بعد سے بے روزگاری ریکارڈ کی سطح پر برقرار ہے۔ فروری کے آخر تک کرونا وائرس کی وجہ سے بے روزگار افراد کی تعداد ۱۰ رلاکھ سے متجاوز ہونے کی توقع ہے۔ اسرائیلی وزارت خزانہ نے خدشہ کا اظہار کیا ہے کہ بے روزگاری کا بحران سال بھر جاری رہے گا۔ خواہ وائرس سے بچاؤ کی مہم کامیاب ہوجائے اور مستقبل قریب میں پابندیاں ختم ہوجائیں۔ (صحافی دکن، حیدرآباد، ۲۳ جنوری ۲۱ء، ص ۴)

''خودکار کشتی''

ایک امریکی کمپنی نے ایک ایسی ڈرون کشتی تیار کی ہے جو شمسی توانائی سے خودکار انداز میں آگے بڑھتے ہوئے سمندری فرش کا نقشہ بنائے گی اور سمندری ماحول کا قیمتی ڈیٹا بھی جمع کرے گی، شہر الامیڈا میں واقع سیل ڈرون کمپنی اس سے قبل کئی ماڈل بنا چکی ہے لیکن یہ سب سے بڑا اور جدید ماڈل ۲۳ فٹ طویل تھا۔ کئی اداروں کے تعاون کے بعد سیل ڈرون کو مزید بہتر بنایا گیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ہوا کی قوت سے آگے بڑھتی ہے لیکن اس پر برقی آلات و سینسر بھی لگے ہوئے ہیں۔ اسے کنٹرول بھی کیا جاسکتا ہے اور خودکار انداز میں بھی چل سکتی ہے۔ پانی میں حیاتی مواد (بایوماس) اور سمندر میں گھلی کاربن کی پیمائش اس کے اولین مقاصد میں شامل ہے۔ اس کا تیسرا ہدف سمندری گہرائی میں فرش کی نقشہ کشی ہے کیوں کہ اب تک صرف ۲ فیصد سمندر میں فرش کو دیکھا جاسکتا تھا۔ حالیہ برسوں میں سمندری فرش پر ماہرین کی دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔ سیل ڈرون میں نصب جدید ترین سونار سمندر کی تہہ کو منظم انداز میں نوٹ کریں گے یہاں تک کہ سونار ۷ ہزار میٹر کی گہرائی تک کام کرتا ہے جسے ہم سمندری سروے بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ کشتی میں موجود ڈی این اے بھانپنے والے آلات پانی سے ڈی این اے اخذ کرکے میٹا جینومکس انداز میں کام کریں گے اور سمندری حیات اور پودوں کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کریں گے۔ اس سے قبل سیل ڈرونی کشتیاں مجموعی طور پر مختلف سمندروں میں ایک ہزار دن گزار چکی ہیں۔ (تاثیر، پٹنہ ۲۸ جنوری ۲۱ء، ص ۷)

(ک۔ ص۔ اصلاحی)

معارف کی ڈاک

مکتوب میرپور کشمیر

عالی قدر! السلام علیکم، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

راقم نے ''معارف میں مشاہیر کے مکتوبات: تدوین، حواشی و تعلیقات'' کے عنوان سے ایم۔فل کی سطح کا مقالہ لکھ کر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ۲۰۱۸ء میں ڈگری حاصل کی۔

راقم کے مقالے میں جولائی ۱۹۱۶ء سے ۱۹۵۵ء تک شائع ہونے والے مکاتیب شامل ہیں، جن کے حواشی و تعلیقات بھی لکھے گئے ہیں۔ مقالہ متذکرہ ڈاکٹر ظفر حسین ظفر کی نگرانی میں مکمل ہوا جس کے خارجی ممتحن ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی تھے۔

راقم اپنے مقالہ دارالمصنّفین کو برائے ملاحظہ و تبصرہ پیش کرنا چاہتا ہے اور اس کو کتابی شکل دینے کا خواہاں ہے۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔ والسلام

(جناب) مشتاق احمد ساقی

شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج میرپور، کشمیر

مکتوب حیدر آباد

مدیر محترم! السلام علیکم

خدا کرے آپ اور معارف بہ عافیت ہوں۔ آمین

۱۔ دسمبر ۲۰ء کے شمارے میں ''اغیار کے حقوق'' والا مضمون اگرچہ وحشت ناک ہے لیکن جناب خان یاسر نے تقابلی مطالعہ خوب کیا ہے:

ع دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا

ے جغرافیائی ''بحر ہند'' نہیں بلکہ موجودہ سیاسی بحر ہند!

۲۔ اکتوبر ۲۰ء کے شمارے میں ص ۳۱۵ پر ایک مصرع یوں چھپا ہے:

ع جی بہت لگتا ہے صحبت میں ان کی

لیکن میرے حافظے میں تو پورا شعر یوں ہے:

بہت لگتا ہے جی محفل میں ان کی ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

خادم

(جناب) ابن غوری (ہوا کرے کوئی)

وفیات

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری مرحوم

(۱۹۴۰ـ۲۰۲۱ء)

زمین میں آسمانوں کے سما جانے کا سلسلہ ہے کہ رکتا ہی نہیں، اس مہینہ کا آغاز ہی ہوا تھا کہ ۲؍فروری کو ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کی رحلت کی خبر ملی، اس دو تاریخ نے گویا غم کو دو چند کر دیا کہ ۲۰۰۸ء میں اسی تاریخ کو دارالمصنّفین کے ناظم و مدیر معارف مولانا ضیاء الدین اصلاحی بھی ایک عالم کو سوگوار کر گئے تھے، ڈاکٹر شاہجہاں پوری کی خبر عرصہ سے نہیں تھی لیکن ان کی وفات کی اندوہ ناک خبر کے لیے بھی دل تیار نہ تھا، ہندوستان میں بجز خواص کے کم ہی کو علم ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت میں علم کا کیسا وسیع، متنوع بلکہ متضاد رنگوں کا جہاں آباد تھا، روہیل کھنڈ کا خطہ بھی کیا عجیب ہے، تاریخ، تحقیق، تنقید، تدوین، تذکرہ، ترتیب کے عنوانوں میں سے اردو زبان و ادب کو اس نے صولت و ثروت تو عطا ہی کی، ایک بانکپن بھی اس کی پہچان بنا رہا، ڈاکٹر صاحب مرحوم بھی اسی روہیل کھنڈی تہذیب کے بانکے نمائندے تھے۔ والدین نے نام تصدق حسین خاں رکھا لیکن شہرت عربوں کے طریق کنیت سے ایسی ملی کہ ابوسلمان کو جاننے والے اکثر تصدق حسین سے بے خبر رہے، مراد آباد کے مدرسہ شاہی میں حافظ قرآن ہوئے لیکن ڈاکٹر نے لفظ حافظ کو ہی حافظہ سے محو کر دیا، پردادا مجو خاں ۱۸۵۷ء میں شہید ہوئے تھے، معرکہ میں ان کے چھوٹے بھائی امان خاں بھی شامل تھے، ان کو خاندان کی دیکھ بھال کے لیے میدان جنگ سے واپس کر دیا گیا، بقول ڈاکٹر صاحب ''یہ مقصد تو پورا نہ ہوا، خاندان کے مقدر میں جو اجڑنا تھا وہ تو اجاڑ ہو کر ہی رہا اور ایسا اجڑا کہ پھر کبھی آبادی اور خوش حالی نے پلٹ کر نہ دیکھا، خاندان کے بارے میں اس اختصار کی تفصیل نہیں معلوم لیکن سرخروئی اور سربلندی ان کے خاندان سے رخصت بھی نہ ہوئی، ان کے ایک بزرگ چچا مولانا محمد عبدالہادی خاں، مولانا مفتی کفایت اللہ شاہجہاں پوری کے خاص شاگرد تھے اور مشہور انقلابی شہید اشفاق اللہ خاں کے رشتہ دار

بھی تھے، ڈاکٹر صاحب مولانا عبدالہادی کی تربیت میں پلے بڑھے، دینی ذوق اور سیاسی وسماجی خیالات کی دنیا بھی اسی تربیت میں ڈھلی اور ڈاکٹر صاحب کی شادی بھی مولانا کی بھتیجی سے ہوئی، یہ سب اس لیے یاد رکھنا ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے بقول مجھے جو کچھ بننا تھا وہی بنا۔

اب اس بننے کو کیسے بتایا جائے کہ قریب اسی برس کی عمر میں ان کی کتابیں پونے دوسو کے قریب شمار کی گئیں ،فرد واحد کی کثرت تصانیف میں اردو ایسی گئی گزری نہیں ، ہندو پاک میں ادھر تصنیفات وتالیفات میں کوئی حد بندی یا منصوبہ بندی نہیں رہ گئی، کچھ اہل قلم تو ایسے ہیں کہ خود یہی دعا کرتے ہیں کہ میرے خدا مجھ سے یہ حساب نہ مانگ لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم ان معدودے چند محققین میں ہیں جن کے قلم نے آموختہ نہیں دہرایا بلکہ جب بھی کوئی کتاب ان کے نام سے آئی تو گویا اردو میں ایک نئے موضوع سے متعارف کرا گئی ،بعض حوصلہ مندوں نے کتب شماری کے بعد بتایا کہ صرف مولانا آزاد پر ان کی چالیس کے قریب کتابیں ہیں ،عربی کے ساتھ عصری تعلیم کا سلسلہ بھی اس کار جہاں کی درازی میں برابر کا شریک رہا،مضامین کی بات ہو تو ان کے شمار کرنے کے لیے وقت اور وقت لگانے والوں کی ایک جماعت چاہیے،ڈاکٹر صاحب کا تعلق خاص مولانا ابوالکلام آزاد سے ظاہر و ثابت کیا جاتا ہے کہ جس پیمانہ پر انہوں نے ابوالکلام کی حیات کا احاطہ کیا برصغیر میں کوئی اور فرد واحد نہیں کرسکا،ان کی یہ بے مثال خدمت اس وقت اور بھی لائق بن جاتی ہے جب یہ احساس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد پر محنت کے لیے سرکاری سرپرستی کے حصول کا بھی امکان ہے لیکن پاکستان میں ابوالکلامیات کا پرچم مستقل ومسلسل بلند کیے رہنا اتنا آسان نہیں تھا،اصل معاملہ نیت کی پاکیزگی کا ہے، ڈاکٹر صاحب کو علمائے ہند بالخصوص علمائے دیوبند سے محبت ان کے مربی مولانا عبدالہادی کی صحبت میں ملی اور جس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کا سب سے پہلا مقالہ مولانا سید حسین احمد مدنی پر شائع ہوا، برکت ساری اسی نیت کی تھی کہ انہوں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن،مولانا عبیداللہ سندھی،مفتی کفایت اللہ دہلوی،مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی،مولانا احتشام الحق تھانوی جیسے بزرگوں اور مولانا غلام رسول مہر،شہید اشفاق اللہ خاں اور علمائے ہند پر خدا جانے کتنی کتابوں اور مضامین کا انبار لگادیا، یہاں تصنیفات وتالیفات کے فرق کی بھی ضرورت نہیں ،مولانا آزاد کے مضامین الندوہ کا مجموعہ ہو، یا مولانا عبدالماجد دریابادی کے خطوط کا، ان کے مقدمے حواشی اور تعلیقات کی وجہ سے

ہر کتاب اپنے وجود کی اہمیت کا اعلان کرتی نظر آتی ہے اور اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ ان کے خیالات کی قطعیت کا بھی، مثلاً ایک کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے لکھا کہ ''مولانا آزاد کے معاصر دوست صرف مولانا سید سلیمان ندوی ہیں، معاصرت کا اطلاق واقعی ان ہی پر ہوتا ہے، وہ ذاتی روابط سے لے کر علوم وفنون اور سیرت وخدمات کی جامعیت میں مولانا آزاد کی مقابل و معاصر شخصیت تھے''، شیخ الہند پر ان کی کتاب بغیر کسی شبہ کے ان کے سیاسی افکار کا دستاویزی مجموعہ کہی جاسکتی ہے، مولانا محمد میاں نے جہاد اسلامی پر شاہ ولی اللہ دہلوی کے افادات کی بنیاد پر ایک رسالہ جہاد اسلامی اور دور حاضر کی جنگ کے نام لکھا، اس رسالہ کو ڈاکٹر صاحب نے جس محنت سے مرتب کیا ہے وہ اپنی جگہ لیکن مقدمہ میں انہوں نے جس جرأت و بے باکی سے حق گوئی کا حق ادا کیا، کم لکھنے والے یہ حوصلہ دکھا سکتے ہیں، یہ بے باکی ان کی سرشت میں تھی، مولانا احتشام الحق تھانوی میں یہ کہیں کہیں حد اعتدال سے متجاوز بھی ہے اور یہی حال خطوط ماجدی کا ہے لیکن ان کی کتابوں میں شاہجہاں پور تاریخ عمومی اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ذکر ناگزیر ہے، اس کی تالیف کا منصوبہ انہوں نے رشید حسن خاں کے مشورہ سے بنایا تھا اور اس میں بھی انہوں نے اپنے مطالعہ وتحقیق کا وہ جوہر دکھایا جس کو بے مثال ہی کہا جاسکتا ہے، کیا کیا لکھا جائے، ہمارے اردو اخبارات میں تو ان کے انتقال کی خبر کو بھی شاید کسی کونے میں جگہ ملی۔

ڈاکٹر صاحب کے کچھ مضامین معارف میں بھی شائع ہوئے ۲۰۱۰ء میں انہوں نے ایک خط لکھا تھا اور فرمایا تھا کہ اسے شائع نہ کیا جائے، لیکن دل نہ مانا اور یہ خط شائع ہوگیا، ۲۰۰۵ء میں وہ ہندوستان آئے تھے، دیوبند، علی گڑھ، کلکتہ، پٹنہ، سب جگہ گئے، شاید اعظم گڑھ بھی تشریف لاتے مگر پٹنہ میں ایک حادثہ کی وجہ سے پاکستان واپسی کے لیے مجبور ہوگئے، وہاں سے انہوں نے معارف کے نام خط میں حادثہ کی داستان کے بعد جو کچھ لکھا وہ یہاں پر درج کیا جاتا ہے، معارف نے اس خط کا عنوان ''ہندوستان اور زندگی کا سفر'' رکھا، انہوں نے لکھا کہ:

''یہ داستان میں نے ایک معذرت کے لیے آپ کو سنائی ہے، میرا یہ سفر بہ عنوان علمی و تحقیقی سفر تھا، میں کراچی سے ایک لٹریری اسسٹنٹ کو لے کر گیا کہ میری صحت کا یہی تقاضا تھا لیکن جب میں ہسپتال میں داخل ہوا تو میرے لٹریری اسسٹنٹ مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے، میرے لیے وطن سے دور غیر ملک میں جسے میں غیر کہنا پسند نہیں کرتا، سفر میں کمزوری اور مجبوری کے احساسات ہی کیا کم

موجب اندوہ وغم اور پریشان کن تھے کہ ایک عزیز ورفیق نے اپنی جدائی کا داغ لگایا اور مجھے تنہائی اور بے یار و مددگار ہونے کے احساس کے عذاب میں مبتلا کیا، ذہن پر اس کا یہ اثر پڑا کہ حافظہ جواب دے گیا اور بہت سے جانے پہچانے انجان بن گئے، نام ذہن سے نکل گئے، اب یاد کرتا ہوں لیکن نام یاد نہیں آتا، یہ بات قابل معافی نہیں سمجھتا لیکن عفو خواہی کی التجا کرتا ہوں۔

دو تین کتابیں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہیں بھیجتا ہوں، معارف میں چند سطریں لکھ دیجیے گا اور متعلقہ پرچہ مجھے ضرور بھیج دیجیے گا، پرچہ سامنے آئے گا تو بہت سی باتیں معلوم ہو جائیں گی، یا یاد آجائیں گی، جولائی کے آخری ہفتہ میں مرحوم ضیاء الدین اصلاحی سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی تھی، یہ بات مجھے یاد ہے اور ملاقات کی مسرت اور خوش وقتی یاد کرتا ہوں۔

خدا کرے بخیر و عافیت ہوں، اب دارالمصنّفین کی رہنمائی آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ بڑی ذمہ داری ہے، آپ کا اخلاص و ایثار کام آئے گا۔

خاکسار

(جناب) ابوسلمان شاہجہاں پوری‘‘

اخلاص و ایثار کے کام آنے کی گواہی ان جیسی شخصیتوں ہی کو زیب دیتی ہے، اس مختصر سے تعزیتی مضمون میں اتنی گنجائش کہاں کہ ان کی تدریسی ذمہ داری کی تفصیل ہو، ’’آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، جناح لٹریری سوسائٹی، انجمن ترقی اردو، مقتدرہ قومی زبان‘‘ جیسے بڑے اداروں میں وہ اپنی موجودگی کی اہمیت کا احساس دلاتے رہے، ان کے بارے میں کیا خوب کہا گیا کہ انہوں نے جس گھر میں زندگی کا بڑا حصہ گزارا اسے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا، اینٹیں خود بنائیں، دیواریں خود چنیں اور چھت بھی ڈالی، بالکل اسی طرح اپنی شخصیت کی تعمیر بھی خود کی، زندگی کو جہد مسلسل کا نام دیے جانے کے لیے کتنے اشاعتی ادارے خود ہی قائم کیے، ایسی مثالیں اب تو گویا نایاب ہیں، شاہجہاں پور سے نواب شاہ اور پھر کراچی، یہ سب بس حکم سفر کی تعمیل کی کہانی ہے، آزاد کے عاشق قفس عنصری سے آزاد ہو کر شاید یہی کہہ رہے ہوں کہ.....................اب میرا انتظار کر،

اللھم ارحمہ واغفرلہ ۔

(ع۔ص)

ادبیات

غزل

جناب جمیل مانوی

میری وفا کا ذکر جب چھڑ گیا بات بات میں
تارے سے جھلملا اٹھے اہل جنوں کی رات میں

یہ بھی ہے ایک سانحہ عمر کے سانحات میں
میرے لیے نہ تھی کوئی ریکھا تمہارے ہات میں

تیری صدائے دل فروز، میری نوائے سینہ سوز
دونوں ہی کارگر نہیں معرکۂ حیات میں

دنیا بنی، بگڑ گئی، یہ تو ذرا سی بات ہے
کتنے ہی رنگ اور تھے تیری نوازشات میں

اپنے وفا شعار کو ایسی نگاہ بخش دے
اپنا نشاں بھی پا سکوں تیری تجلیات میں

آنکھوں سے ایک رات کی قیمت ادا نہ ہو سکی
جلوے بکھر بکھر گئے پہلوئے التفات میں

سینے میں کتنے تیر ہیں اس کی انہیں خبر نہیں
وہ تو یہی گنا کیے پھول ہیں کتنے ہات میں

اپنے ہی گھر میں زندگی بوجھ بنی ہوئی ہے آج
وہ بھی زمانہ تھا کہ ہم رہتے تھے شش جہات میں

ایسی ہی کتنی نعمتیں ہاتھ میں آ کے کھو گئیں
جیسے تمہارا ہاتھ ہے اور کسی کے ہات میں

میری کتاب زندگی ایسی بھی بے مزہ نہ تھی
تیرا بھی تذکرہ ملا دل کے تبرکات میں

تیرے بغیر زندگی جیسے خلا میں کھو گئی
تیرے علاوہ کچھ نہ تھا آنکھوں کی کائنات میں

ان کے ہمارے درمیاں اتنے بھی فاصلے نہ تھے
کس نے یہ زہر بھر دیا حسن تعلقات میں

مرنے سے پہلے دل میں تھی جینے کی آرزو جمیل
وہ بھی تو کھو گئی کہیں دل کے تغیرات میں

☆ ۳۴۰، گریس اکیڈمی، نور بستی، سہارن پور۔

”کہ خیموں کو اکھڑنا ہی پڑے گا“

☆ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

اَنا کے ساتھ اَڑنا ہی پڑے گا — تو پھر اب خود سے لڑنا ہی پڑے گا
سدھر جائے، جو خود چاہے سدھرنا — جو بگڑے گا، بگڑنا ہی پڑے گا
نہ ہو جامے سے اپنے کوئی باہر — کہ بالآخر سکڑنا ہی پڑے گا
تخیّل کی قبائیں سینے والو! — انہیں اک دن ادھڑنا ہی پڑے گا
رکھو آباد، دل، ذوقِ سفر سے — کہ خیموں کو اکھڑنا ہی پڑے گا
پرانے ہوگئے جو پھول، پتے — انہیں پیڑوں سے جھڑنا ہی پڑے گا
نہ دنیا سے بہت دل کو لگاؤ — کہ بالآخر بچھڑنا ہی پڑے گا
محل خوابوں کے جو کرتے ہو تعمیر — رئیسؔ ان کو اجڑنا ہی پڑے گا

دکتر ظفر احمد صدیقی

پروفسور بخش اردو

دانش گاہِ مسلمان در علی گڑھ

بود آن کہ اہل فطنت وہم اہل نظر مُرد — سودای علم داشتہ مردی کہ بہ سر، مرد
تا چہل سال داشت بہ تصنیف و درس کار — ماندہ بہ دور از عملِ فتنہ و شر، مرد
امروز عزیزان بسپردند زیر خاک — گویند کہ دی روزہ بہ ہنگامِ سحر، مرد

تاریخ فوت او بہ زبان قلم رئیس،

سہ بار ”آہ“ گفتہ بگفتیم ”ظفر مرد“

۱۴۲۴ ۶ + ۳ = ۱۸

۱۴۲۴+۱۹=۱۴۴۲ھ (۲۰۲۱ء)

☆نعمانی منزل، مکان نمبر ۴/۰۴۷، جے-۲۴، نزد: ابوہریرہ مسجد (بی-جمال پور) علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی - زندگی کے تابندہ نقوش، از مولانا طارق عمیر عثمانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۵۴، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: دارالسلام اسلامک سینٹر، دہلی گیٹ، مالیر کوٹلہ - ۱۴۸۰۲۳، پنجاب۔

مولانا فضیل الرحمٰن عثمانی تھے تو دیوبند کے مشہور عثمانی خاندان سے لیکن عام شہرت ان کو پنجاب میں بچے کھچے مسلمانوں کے نمائندہ اور راہنما کی ملی، ان کی تحریریں اور تقریریں پورے ملک میں بڑی توجہ سے پڑھی اور سنی جاتیں اور ان کی قدر کی جاتی، وہ اعلیٰ درجہ کے صاحب قلم تھے، تفسیر نور القرآن اور روح القرآن کئی کئی جلدوں میں ہے، سیرت پر بھی کتاب ہے لیکن ان کا اصل موضوع فقہ ہی ہے جس میں انہوں نے اسلامی قانون جیسی عمدہ کتاب بھی لکھی اور ان کے فتاویٰ کا ایک انتخاب بھی ہے، ایسی متحرک، بامقصد اور دردمند شخصیت کا مطالعہ یقیناً فائدہ کا سبب ہوتا ہے، اسی غرض سے ان کے سعید و صالح فرزند اور خود ایک خوبصورت اسلوب کے حامل نے بڑی نفاست سے اپنے والد ماجد کی سیرت مرتب کر دی جس میں ملک کے ممتاز علما و مشاہیر علما کے مضامین یکجا کر دیے گئے، خود مولانا عثمانی مرحوم کی متعدد تحریروں کو بھی جمع کیا گیا، ان کے بارے میں یہ کہنا بالکل درست ہے کہ عام طور پر ان کا سا ادبی اور فقہی ذوق یکجا نہیں ملتا، مولانا کے مضامین و خطبات میں ایک اور نمایاں بات بلکہ خوبی یہ ہے کہ وہ مخاطب کی نفسیات اور اس کے مزاج و طبیعت کو بہت جلد بھانپ لیتے تھے، اس لحاظ سے ان کی باتوں کا اثر اور بڑھ جاتا، قادیانیت کی حقیقت سے آگاہ کرنے اور پھر اس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے متعلق ایک جگہ لکھا گیا کہ مولانا عثمانی مرحوم نے حد درجہ خاموش مگر مضبوط طریقہ سے اس فتنہ کا سامنا اور خاتمہ کیا، اس کے لیے شاگرد تیار کیے، چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ پنجاب کے اکثر علما بالواسطہ یا بلا واسطہ ان ہی کے شاگرد ہیں اور یہ اعتراف تو ہر زبان پر ہے کہ تقسیم ملک کے بعد پنجاب کی دینی اعتبار سے اجڑی ہوئی زمین کی نئی زندگی ان ہی کی مساعی کی برکت ہے، دارالسلام کے نام سے ان کا ایک رسالہ بھی شائع ہوتا تھا، یہ کتاب گویا اسی رسالہ کا خاص شمارہ بھی ہے اور مضامین و مشمولات کی خوبیوں سے یہ واقعی خاص ہے۔

کہکشان جامعہ از مولانا محمد ثناء اللہ عمری، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۳۱۶، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: ادارہ تحقیقات اسلامی، جامعہ دارالسلام، عمر آباد - ۶۳۵۸۰۸ ٹمل ناڈو۔

علم وعمل اور انفرادیت و اجتماعیت کے جامع جب متعدد ہوں تو تابندہ نقوش کہکشاں بن جاتے ہیں، ٹامل ناڈو بلکہ محض عمرآباد ہی کہا جائے تو ہندوستانی مسلمانوں کی علمی واصلاحی وتبلیغی حالات کا شاید ہی کوئی جاننے والا ہو جو عمرآباد یا اس سے منسوب عمریوں سے ناواقف ہو، کاکا عمر یا کاکا سعید یا ان کے فرزند سعید تک ایک دنیا ہے جس کے آسمان پر قریب ایک صدی سے تاروں کی بارات سج سج کر نکلتی رہی، اس کتاب کے فاضل مرتب خود بھی اسی کی علمی وفکری فضاؤں سے تشکیل پائی ہوئی نمائندہ شخصیت ہیں، انہوں نے اپنے قلم کی مسیحائی سے خدا جانے کتنوں کو زندگی عطا کردی جو ذرا سی غفلت سے خلائے بسیط میں گم نام ہوکر رہ جاتے، اس کتاب میں جدت یہ ہے کہ اس میں قریب چالیس ان علما کا ذکر آگیا جو جامعہ دارالعلوم میں درس وتدریس سے وابستہ رہے اور بقول مولانا حفیظ الرحمن عمری یہ وہ لوگ تھے جو جامعہ کے اصل مقاصد اور عزائم کو بروئے کار لانے میں معاون و مددگار بنے، ایک صدی کے اساتذہ کی داستان سنانا کوئی آسان بات نہیں، مگر فاضل مصنف واقعی تذکرہ نگاری کے میدان کے شہسوار ہیں، یہ دعویٰ پھر ثابت ہوگیا، مولانا ثناء اللہ صاحب بجائے خود اس لیے مستحق ثنا ہیں کہ آندھرا پردیش میں مچھلی پٹنم جیسے غیر اردو خطہ میں انہوں نے لکھنؤ ہی نہیں اودھ کی اس قصباتی زبان اور اسلوب کو درآمد کرلیا جس پر مولانا دریابادی کو صاحب طرز واسلوب ادیب ہونے کا حق ملا، ان کی زبان جب اہل علم وفن کی مجلسوں کی داستان سنائے تو پھر محفل پر کہکشانی رنگ چھانے سے کون روک سکتا ہے۔

انوارِ تحقیق از ڈاکٹر سید شاہد اقبال، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۰، قیمت ۲۸۰ روپے، پتہ: آستانہ حق، روڈ نمبر ۱۰ (ویسٹ بلاک)، نیو کریم گنج، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱، بہار اور ملک کے مقتدر مشہور مکتبے۔

اس کتاب سے پہلے بھی لائق مصنف کی کئی کتابیں شائع ہوئیں، ان میں رموز تحقیق اور نشر تحقیق بھی شامل ہیں، اس سلسلہ میں زیر نظر انوار تحقیق ہے، نام سے ذہن ایسے موضوع کی جانب منتقل ہوا جہاں گیان چند اور قاضی عبدالودود سے لے کر خدا جانے کتنے اصحاب تحقیق کا ذکر چھڑ جاتا ہے، مگر جب تحقیقی مضامین کے زیر عنوان کچھ اولیائے بہار اور کچھ مشاہیر ادب کا ذکر و تذکرہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اس کتاب کا نام انوار تحقیق کیوں ہے؟ وجہ صاف ہے اور مصنف کے لفظوں میں اس طرح ہے کہ ''میں ہمیشہ گم شدہ مشاہیر کی تلاش میں رہا''، کھوئے ہوؤں کی جستجو کو تحقیق کا نام دیا ہی جانا چاہیے، بلوچستان، انڈمان، نکوبار، صوبہ سرحد اور سری لنکا میں ناموران بہار کے نام ونشان کی تلاش واقعی

داد کے قابل ہے، مصنف کی باتوں کی طرح ان کی تحریروں میں ایک معصومانہ لہجہ بڑا اچھا لگتا ہے، ان کی محنت کی داد یوں تو اردو کے قریب تمام بڑوں نے دی ہے لیکن سید حامد مرحوم کے یہ الفاظ سند سے کم نہیں کہ ''آنکھیں خیرہ ہوگئیں کہ بہار میں علم و فضل کی روایت کس قدر وسیع اور طویل ہے''۔

سہرے کی ادبی معنویت از ڈاکٹر امام اعظم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۲۰، قیمت ۳۵۰ روپے، پتہ: تمثیل نو پبلی کیشنز، محلہ گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، دربھنگہ-۷، بہار اور کئی اور مکتبے۔

رسالہ تمثیل نو اور تنقید و تحقیق اور شعر و ادب پر کئی کتابوں کی وجہ سے اردو کی نئی نسل میں خصوصاً بہار و بنگال کے علاقوں میں اس کتاب کے مصنف کی امامت مسلم ہے، نئے نئے پہلو تلاش کرنے اور موضوعات میں جدت لانے کے لحاظ سے امام اعظم کہنا بھی جائز ہے اور اس کی دلیل زیر نظر بڑی دلچسپ اور اتنی ہی معلومات افزا کتاب ہے، اب وہ معاشرہ اور شادی بیاہ کی وہ محفلیں کہاں جہاں ''قبول ہے'' کے معاً بعد محفل ہے شاہانہ مبارک باشد کی صداؤں اور پھر مسلسل سہروں کے ترنم کی بارش میں تر ہو جاتی تھیں، یقیناً دور حاضر میں بھی کہتے ہیں سخنور سہرا، مگر وہ روایت اور چلن اب کہاں، ایسے میں امام اعظم نے کتاب السہرا کی تدوین کا واقعی انوکھا کام کیا اور نئے پرانے لکھنے والوں کی تلاش کے بعد سہرے کی معنویت، عظمت، ادبی و عصری روایت، سہروں کے شعری اسلوب کے ساتھ ساتھ سہرا نگاروں کی ایک ایسی لڑی پرو دی جس کی جلوہ آرائی قابل دید ہے، غالب و ذوق کے سہروں پر تو تاریخ کی نظر ہے لیکن بات سہروں کی ہو اور اس شان سے شروع ہو کہ سہرا موقع محل کی صنف ہے تو قاری کے لیے چونکنا ضروری ہے اور یہ سن کر اور بھی لطف آتا ہے کہ گو یہ صنف فرمائش پر ضرورتاً وجود میں آئی لیکن اس کا شجرہ قدیم ہے اور اتنا قدیم کہ عربی قصیدہ گوئی سے جاملتا ہے، یہ کہنا بھی پر لطف ہے کہ سہرے کے لیے کوئی مخصوص زمین طے نہیں، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے صرف روئے نوشہ ہی درکار ہے، کتاب واقعی دلکش ہے اور یہ کہنا سچ ہے کہ پہلی بار سہرے کی معنویت و ادبیت پر ایسے وقیع مضامین ملتے ہیں، حیرت تب ہوتی ہے جب فاضل مرتب صرف بہار کے شعری گلدستہ شماری میں سیکڑوں کی نشاندہی کرتے جاتے ہیں، ایسی انوکھی محنت کی داد نہ دینا ظلم ہے۔

رفاقت کی خوشبو از ڈاکٹر مقصود احمد مقصود، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش،

صفحات ۲۰۳، قیمت ۱۸۰ روپے، پتہ: امرین بک ایجنسی، جمال پور، احمد آباد گجرات اور ۲۰۳۔ شفا کمپلیکس، تانڈلجا روڈ، بڑودہ۔ ۳۹۰۰۲۰، گجرات۔

بڑودہ یا وڈودرا کے نام سے ذہن جن اشخاص خاص کی جانب منتقل ہوتا ہے ان میں جناب مقصود بھی ہیں، وہ صرف وہاں کی یونیورسٹی کے عربی، فارسی، اردو شعبہ کے صدر ہی نہیں اس تاریخی شہر کی ادبی روایتوں کے امین بھی ہیں، نثر و نظم دونوں منزل مقصود ہیں، اس کے بعد ذہن و قلب کی رفاقت کی اہمیت ظاہر ہے، اس شعری مجموعہ میں اسی کی خوشبو سمائی ہوئی ہے، اس اجمال کی وضاحت کے لیے یہی شعر کافی ہے کہ:

یاالٰہی! مری بس ایک تمنا ہے یہی   تیری خوشبو سے رفاقت مری سانسوں میں رہے

وہ شکیل بدایونی، فضا ابن فیضی جیسے شاعروں سے متاثر ہیں، فضا کو وہ فیض سے بھی برتر مانتے ہیں، خود کو باقاعدہ سخنور نہیں سمجھتے، مگر حمد و نعت، غزل، نظم، قطعہ ہر جگہ ایسے اشعار ہیں جو بے اختیار مکرر کا مطالبہ کرتے ہیں:

نیزہ نیزہ سروں کے چراغ   اس نے کس رات اچھالے نہیں
آگ میں جل رہی ہے حیات   پھر بھی جسموں پہ چھالے نہیں
گھر کی ویران تقدیر میں   مکڑیوں کے بھی جالے نہیں

گجرات کی سرزمین سے سر اٹھانے والے یہ شعر بتاتے ہیں کہ تخیل کا محاکات سے کیا تعلق ہے۔

مشعل راہ از جناب ابوالفیض عزم سہریاوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۵۶، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: بی۔ ۲۷۴، المرتضیٰ اپارٹمنٹ III فلور، اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵۔

عزم سہریاوی ظاہری طور پر ان شاعروں کی یاد دلاتے ہیں جن کے ہاتھوں پر بیعت بھی کی جاسکتی تھی، معنوی طور پر بھی زیادہ فرق نہیں، شاعری ان کے لیے معاشرہ کی اصلاح کی ایک پر اثر کوشش ہے، اس مجموعہ میں ان کی نظمیں ہیں، بقول اختر الواسع صاحب نظموں کے عنوانات ہی شاعر کے جذبات و احساسات کی شدت کا پتہ دیتے ہیں، نمونہ کے طور پر نظم کیفی اعظمی کا آخری سفر ہے، گنجائش نہیں ورنہ کچھ اشعار ضرور نقل کیے جاتے، اس کے لیے باذوق قارئین اس کتاب سے محروم رہنا یقیناً پسند نہیں کریں گے۔ (ع۔ص)

رسید کتب موصولہ

اظہار وارثی شخصیت اور فن: شارق ربانی، قلعہ نانپارہ، ضلع بہرائچ (یوپی) قیمت ۱۰۰ روپے

العلامۃ المحدث محمد فاخر زائر الالٰہ آبادی: راشد حسن مبارک پوری، مکتبہ ابوالفضل نئی دہلی۔

قیمت ۱۸۴ روپے

راکھ میں چنگاری: پروفیسر طاہرہ وحید، ایم۔آر۔پبلی کیشنز، میٹروپول مارکیٹ، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔ قیمت ۴۲۵ روپے

متاعِ فکر: حبیب الرحمٰن چغانی، مکتبہ جامعہ شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔ قیمت ۴۰۰ روپے

مشرقی علوم اور کلاسی فیکیشن: عبدالرحمٰن خالد فلاحی، فلاحی بک ڈپو، مسافر خانہ، تکیہ، اعظم گڑھ۔

قیمت ۶۷ روپے

مناظر گیلانی: ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی، مکتبہ الانور شاہ منزل، محلہ خانقاہ، دیوبند (یوپی)۔

قیمت ۱۷۰ روپے

موجِ غبار: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور، مہاراشٹر

قیمت ۲۰۰ روپے

موجوں کا اضطراب: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور، مہاراشٹر قیمت ۲۰۰ روپے

ہندوستان میں مطالعہ قرآن مجید معاصر منظر نامہ (۲۰۲۰ء): ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری، خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ قیمت درج نہیں

یادگارِ سحر: طاہرہ وحید عباسی و شاہدہ پروین۔ پتہ درج نہیں۔ قیمت ۳۵۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعرالعجم اول	300/-
شعرالعجم دوم	150/-
شعرالعجم سوم	125/-
شعرالعجم چہارم	200/-
شعرالعجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس ودبیر	250/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم ومصر وشام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی) //	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) //	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) //	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) //	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) //	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) //	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری) //	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	150/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول //	150/-
مکاتیب شبلی دوم //	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print

MARCH 2021 Vol - 207 (3)

RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP-43/022

Monthly Journal of

Darul Musannefin Shibli Academy

P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

۱۔	سیر الصحابہ اول	حاجی معین الدین ندوی	300/-
۲۔	سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندوی	220/-
۳۔	حیات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	650/-
۴۔	تذکرۃ الفقہاء اول	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
۵۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۶۔	حکیم الامت۔نقوش وتاثرات	مولانا عبدالماجد دریابادی	400/-
۷۔	علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
۸۔	تاریخ اسلام (اول ودوم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	370/-
۹۔	تاریخ اسلام (سوم وچہارم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۰۔	تاریخ دولت عثمانیہ اول	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۱۔	تاریخ دولت عثمانیہ دوم	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۲۔	تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	375/-
۱۳۔	تاریخ اندلس اول	سید ریاست علی ندوی	350/-
۱۴۔	تاریخ اندلس دوم	سید ریاست علی ندوی	220/-
۱۵۔	تاریخ اندلس سوم	سید ریاست علی ندوی	300/-
۱۶۔	مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت	محمد سعود عالم قاسمی	300/-
۱۷۔	عہد اورنگ زیب میں علما کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
۱۸۔	تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں	ظفر الاسلام اصلاحی	100/-
۱۹۔	آثارِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-